سلاخوں سے اِدھر

عائشہ اسلم

سلاخوں سے اِدھر

عائشہ اسلم

نگارشات
میاں چیمبرز ۳۔ ٹمپل روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

سنہ ۱۹۸۸ء

ناشر :- آصف جاوید نگارشات ۳ ٹمپل روڈ لاہور
مطبع :- ایچ وائی پرنٹرز لاہور
قیمت :- ۴۵ روپے

پہلا قدم

انتساب

وقت کے نام

عائشہ اسلم

فہرست

نمبر شمار	مضامین	صفحہ	نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	ادھورے خواب	۱۳	۱۶	پلیٹ فارم	۵۷
۲	گیلی مٹی	۱۵	۱۷	خواہش	۶۱
۳	خوشبو	۱۷	۱۸	بے نام رشتہ	۶۳
۴	ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو	۱۹	۱۹	رتجگے	۶۵
۵	واپسی	۲۳	۲۰	سوالی	۶۷
۶	تعویذ	۲۷	۲۱	دستخط	۷۱
۷	فُٹ پاتھ	۳۳	۲۲	بازگشت	۷۳
۸	ہم دونوں	۳۷	۲۳	عادی	۷۵
۹	زنجیریں	۴۳	۲۴	کمرہ نمبر ۴۵	۷۷
۱۰	آوازیں	۴۵	۲۵	دُھنو	۷۹
۱۱	بلاعنوان	۴۷	۲۶	پی ۔ کے ۔ ۳۰۲	۸۱
۱۲	سایہ	۴۹	۲۷	مکالمہ	۸۳
۱۳	کُنڈلی	۵۱	۲۸	ادھورا خط	۸۹
۱۴	خاموشی	۵۳	۲۹	دائرہ	۹۳
۱۵	رنگوں کی کہانی	۵۵	۳۰	خود شناسی	۹۵
			۳۱	مسلاخوں سے اِدھر	۲۲۷

اُردو

شاعری

نظم: نیند کی سلوٹ

آخری حرف کی تلاش

نثر

ناولٹ: گیلی سڑک

کہانیاں ناولٹ : پہلا قدم

فہرست

۳۱ کہانیاں

تین ناولٹ

لمحہ لمحہ ، اپنا چہرہ ، پہلا قدم
دیوار ، آواز

لمحہ لمحہ ـــــ پانچ حصّوں پر مشتمل ۔
اپنا چہرہ ـــــ پانچ حصّوں پر مشتمل ۔
پہلا قدم ـــــ چھ حصّوں پر مشتمل ۔

دیوار ۔
آواز ۔

کہانی کی کہانی

کہانی کیا ہے۔؟
یہ تو میں نہیں جانتی
ہاں یہ ضرور جانتی ہوں
کہ کہانی ہر آنکھ میں ہر دل میں رہتی ہے
کہانی تنہائی کی شریک ہے
لوگ کہتے ہیں
میری ہر نظم میں کہانی ہے
اور ہر کہانی میں نظم
میں نظم یا کہانی لکھتی ہوں
دستاویزی فلم یا ڈرامہ لکھتی ہوں
ان سب صورتوں میں
میں اپنا آپ لکھتی ہوں
میں نے کہانی کب لکھی تھی؟
میں نے کہانی تب لکھی تھی
جب نظم ادھوری رہ گئی تھی
کبھی کبھی ان کہی بات کہنا پڑتی ہے
میں نے بھی کہی اور ان کہی بات کے لیے کہانی کو تلاش کیا
میں کہانی نہیں لکھتی
کہانی مجھے لکھتی ہے
ہر لمحہ ایک کہانی ہے
لیکن ہر کہانی کاغذ پر نہیں اتاری جا سکتی
کہانی میرا اور تمہارا عکس ہے
کہانی میرا اور قاری کا رشتہ ہے
کہانی میرا چہرہ اور اُن کی آنکھیں ہیں
کہانی تمہارے اور ہمارے بیچ پھیلا فاصلہ ہے
فاصلہ جو نہ ہوتے ہوئے بھی قائم رہتا ہے
پھر کہانی دیوار ہے
کہانی آسمان ہے
کہانی آسمان اور زمین کا تعلق ہے
کہانی خاموشی کی پکار ہے۔
کہانی خواب جتنی خوبصورت ہے
کہانی حقیقت جتنی تلخ ہے
کہانی پراسرار ہے
تو کیا کہانی اک فرار ہے؟
کہانی ایک نئی زندگی کا سندیس ہے
کہانی موت کا انتظار ہے
انتظار جو اذیت کی بہترین مثال ہے
کہانی میں درد کی شدت ہے
کہانی میں خوشی کی لذت ہے

کہانی سمندر کی وسعت ہے
کہانی روح کی گہرائی ہے
کہانی خوشبو ہے
کہانی مسلی ہوئی پتی ہے
کہانی بہار کی صدا ہے
کہانی خزاں کی اُداسی ہے
کہانی میرا جھوٹ اور سچ ہے
کہانی آئینہ ہے
کہانی زندگی سی سستی۔
اور موت سی بے مول ہے
کہانی صرف کہانی ہے
جو ہمیشہ ادھوری رہ جاتی ہے
یا پھر سطروں کے درمیان کہیں کھو جاتی ہے۔!

عائشہ اسلم
۴۸ قطب بلاک اعوان ٹاؤن ملتان روڈ لاہور

ادھورے خواب

سنو! کیوں نہ ہم آج سیر کو چلیں۔ کہیں بہت دُور۔ اس بستی سے دُور اُن منزلوں کی تلاش میں جو ہم نے ابھی پائی بھی نہیں۔ ایک چڑیا نے دوسری سے کہا۔

گھر میں کسی کو پتہ چل گیا تو ——؟

نہیں پتہ چلے گا، ہم دبے قدموں سے جائیں گے بنا چاپ کئے۔ آخر ہمیں بھی تو آزادی ملنی چاہیے۔ ہم بھی کبھی موسموں کی بات کریں۔ ہواؤں کی سرگوشیاں سُنیں۔ دُور بسنے والی چڑیوں کو دیکھیں۔ اُن سے دوستی کریں۔ دنیا کو دیکھیں —— کیا دنیا حسین ہے —— کیا وہ چڑیاں ہم سے زیادہ خوبصورت ہیں یا ——؟

دونوں نے کچھ دیر اپنے فیصلے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا اور دِل جیت گیا۔

پرواز کا سفر شروع ہوا اور جانے کب ختم ہو گیا۔ کبھی بادلوں کی شرارت نے چڑیوں کا تن بھگو دیا۔ کبھی سورج نے غصے سے آنکھ دِکھائی۔ کبھی چاند نے شفقت سے ان کا ماتھا چوما اور کبھی ستاروں نے میٹھی لوری سُنائی۔ یونہی بے خبری اور مستی میں کئی دِن بیت گئے۔ پہاڑوں۔ دریاؤں۔ کھیتوں۔ کھلیانوں۔ جزیروں۔ مکانوں سے چڑیوں نے دوستی کی۔ دوبارہ کبھی آنے کے وعدے کئے اور آگے روانہ ہو گئیں آخر شہر کی روشنیوں میں کھو گئیں۔

ایک دِن سوچا کیوں نہ ہم بھی روشنی بن کر جگمگائیں ان اچھے لوگوں میں ہنسیں، مُسکرائیں۔ اسی خواہش کی انگلی تھامے وہ چلتی چلی گئیں ان بجلی کی تاروں پر —— جانے کس کے کہنے پر مٹی اور ہوا کا سنگم ہوا۔ بارش کی بوندوں اور آندھی نے اس شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا پھر خواہش نے غداری کی اور دونوں معصوم چڑیاں وقت کے اندھے کنوئیں پر تنہا رہ گئیں۔

کچھ دیر بعد دونوں پیاری چڑیوں کے مرجھائے چہرے اُس بستی کے سارے لوگ

دیکھ رہے تھے۔ تاریکی میں سیاہ دل والے دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔
کمبختوں نے سارے محلے کی بجلی بجھائی ٹی وی پر اچھی فلم تھی آج
ہمارے گھر میں تو بڑی زبردست دعوت تھی ـــــ اتنے معزز مہمان آئے ہوئے
تھے ـــــ ابھی کھانا کھانا تھا کہ ـــــ بچوں نے ہوم ورک کرنا تھا ـــــ سب
کو اپنی اپنی فکر تھی ـــــ سب کے اپنے مسائل تھے ـــــ سب کو اپنے دکھ تھے ـــــ
کسی کو بھی اُن کی موت کا کوئی دکھ نہیں تھا۔!!

○

پھول

مرنے والوں کی قبروں پر لوگ پھول کیوں چڑھاتے ہیں؟
شائد اُن کی مہکار سے ہی گناہ دُھل جائیں۔

گیلی مٹّی

ایک چھوٹے بچّے نے کہیں سُنا تھا کہ گیلی مٹی میں گلاب کھلتے ہیں۔ گیلی مٹّی سے تو گھر بھی بنائے جاتے ہیں ـــــ وہی مٹّی جس کی سوندھی خوشبو لوگوں کو مسحور کر دیتی ہے۔

"خوشبو" وہی جو مس کے بدن سے آتی ہے بالکل گلابوں جیسی۔

ننھا بچہ مٹّی میں گلاب کھلانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ مس کا قرب حاصل کر سکے۔ بڑا ہو کر جب وہ افسر بنے گا تب اُسی مس سے شادی کرے گا۔

"شادی" اور اُس کی آنکھوں میں مس دُلہن کے روپ میں جلوے بکھیر رہی تھی۔

وہ جس پل گیلی مٹی میں گلاب کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہی لمحوں میں ایک ہوائی جہاز مس کو اس بستی سے دُور اُڑا کر لے جا رہا تھا۔ کومل بچّے کو خبر نہ ہوئی اور خوشبو کسی اور گلاب کا ساتھ ہوئی!

مشورہ

تم صابن مت استعمال کیا کرو
مگر کیوں؟
تمہاری اپنی خوشبو کھو جاتی ہے۔

خوشبو

سُنیے!

جی ـــ فرمائیے؟

کیا آپ چند لمحے اپنی مصروفیت سے غافل ہو کر میرے ساتھ رہ سکتی ہیں؟

میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں نے جب آپ کو پہلی بار محسوس کیا تھا تب سے میرے ذہن پر ایک بوجھ سا ہے۔ اگر آپ بُرا نہ منائیں تو.....

لگتا ہے آپ خوابوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ورنہ یہی کہنا کافی تھا کہ میں آپ کی بات سُن لوں۔ مگر میں زیادہ دیر تک نہیں رُک سکتی۔

میرے نصیب میں تو سفر ہی لکھا ہے ـــ آہ ـــ نہ ختم ہونے والا سفر ـــ!

اس سفر کے دوران آپ قدموں کے نشان چھوڑ جاتی ہیں مگر ان سے زیادہ پرکشش اور نہ بھولنے والی شے آپ کی خوشبو ہے۔ آپ کے لیے حسین کا لفظ تو مناسب نہیں مگر ہاں یہی خوشبو آپ کی شناخت کا حوالہ ہے۔ یہی مہک لوگوں کو آپ کا اسیر بنا دیتی ہے۔ جانے کیوں میں ان لوگوں سے حسد محسوس کرنے لگا ہوں اور وہ جو آپ کو ہمیشہ کے لیے حاصل کر لے گا۔ خوشبو جس کی قید میں ہوگی۔ اگر یہی خوشبو میرے پاس آ جائے تو ـــ؟

آپ حیرت سے کیوں دیکھ رہی ہیں ـــ کیا میں آپ کی خواہش نہیں کر سکتا ـــ؟

دیکھو! ابھی تمہیں بہت طویل سفر طے کرنا ہے۔ میں تمہارا یا کسی کا بھی انتظار نہیں کر سکتی۔ تم وقت کا انتظار کرو وہ خود ہی کسی خوشبو کو تمہارے سپرد کر دے گا۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی ـــ میرا وجود تھا ہی کب ـــ میں کہاں تھا ـــ کہیں بھی تو نہیں ـــ!

ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو

میں نے اس کے ہاتھ پہ ایک روپے کا نوٹ رکھا ۔ اُس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے اُس کی ہتھیلی پہ جلتا انگارہ رکھ دیا ہو ۔ خاموشی سے وہ نوٹ اُس نے مجھے واپس تھما دیا ۔ اچانک وہ بچہ کتنا بڑا ہو گیا تھا ۔

پھر وقت نے کروٹ بدلی اور میری آنکھوں کے سامنے ایک اور چہرہ آ گیا ۔

وہ مجھے یونہی راستے میں کہیں مل گیا تھا اور میں نے بھی یونہی بہت سی باتیں پوچھ ڈالیں ـــــ وہ تمام باتیں جن کے لیے سارے لفظ ہوا میں اُڑ جاتے ہیں اور کبھی لفظوں کے سہارے ـــــ کبھی ان سہاروں کے بغیر بھی باتیں بہت آسانی سے ہو جایا کرتی ہیں ۔

میں نے اس کا نام پوچھا تھا ـــــ نام جانے کیا تھا ۔ رہی عمر کی بات تو وہ دس گیارہ برس کا تو ہو گا ہی ۔ سکول کی صورت اُس نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی یا گھر والوں نے اس کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا ـــــ بس ایسی ہی کچھ بات تھی جو اُس نے بتائی تھی ۔ اُس نے جو کہانی اپنی مجبوریوں کی اپنی زندگی کی مجھے سنائی تھی وہ ویسی ہی کہانی تھی جو فلموں کے شوق میں گھر سے بھاگنے والی لڑکیاں عموماً سناتی ہیں بلکہ گھڑتی ہیں ۔ اُس بچے نے بھی اپنی زندگی کی کہانی کو پنسل کا سکہ سمجھ کر اپنی مرضی مطابق گھڑنے کی کوشش کی تھی ـــــ پھر میں نے اُس کا کام پوچھا تھا ۔ جب کہ یہ پوچھے بغیر بھی جانا جا سکتا تھا ۔ کپڑے پھٹے پرانے اور میلے تھے ۔ چہرے اور ہاتھ پیروں پر میل کی اتنی تہیں چڑھائی جا چکی تھیں کہ وہ کسی کوئلے کی کان سے نکلے ہوئے کوئلے کی مانند نظر آتا تھا ۔

میرے سوال کے جواب میں اُس نے کہا تھا ـــــ "کام ابھی دکھا دیتا ہوں" ۔

گلیوں محلوں میں پھرنے والے بہت سے گندے بچوں جیسا ہی وہ بچہ تھا ـــــ جس کی ناک بھی بہہ رہی تھی اور رالیں بھی ـــــ مگر اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی ۔ اگر اُسے کسی چیز کی پرواہ تھی تو وہ اس کا

کام تھا اُس نے کہا تھا ــــ میں چوری نہیں کرتا۔ پیسے نہیں مانگتا۔ پیسے بھی کہاں مانگتا ہوں۔ دراصل میری محنت لوگوں کو پیسے دینے پہ مجبور کر دیتی ہے۔

اُس بچے نے بالکل سچ کہا تھا۔ وہ بہت بڑا فنکار تھا۔ اُس کی اداکاری دیکھ کر پتھر دلوں کی آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں۔ عورتیں بڑھ کر اُسے پیار کرتی ہیں۔ اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہیں۔ دعائیں دیتی ہیں اور بچے کی خالی ہتھیلیوں کو سکوں اور روپوں سے بھرنے لگتی ہیں۔ مفلسوں کے دِل اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں جتنا دولت سے اُن کے ہاتھ تنگ ہوتے ہیں۔ جیسے کئی عورتیں یہ بھول کر کہ کچہری سے اگلی بس بدل کر انہیں منزل پر پہنچنا ہے۔ وہ ساری ریزگاری اِس بچے کو دے ڈالتی ہیں اور خود تپتی دوپہر میں پیدل گھروں تک پہنچتی ہیں جہاں کوئی پینو۔ شیداں یا بلّو نلکے کا گرم پانی دے کر پوچھتی ہے۔

ماں تھک گئی ہو ــــ آج بھی کام نہیں ہوا ــــ؟ تو ماں ٹھنڈا سانس بھر کر کہتی ہے نہیں ــــ پُتر ساڈے لیکھ سُتے رہن گے!

بات پھر آگے چلی گئی۔ پچھلے اسٹیشن کی کہانی ادھوری رہ گئی وہ بھی تو پوری کرنا ہے ــــ وہ بچّہ اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرنے کے بعد ساری کمائی ایک ویڈیو گیمز کی دُکان میں جا کر خرچ کر دیتا ہے اور پھر نئے سرے سے اگلے سین کی تیاری شروع کر دیتا ہے جہاں کوئی کیمرہ نہیں ہوتا مگر کئی آنکھیں اس منظر کو قید کر لیتی ہے ــ جہاں اداکاری سکھانے والے ہدایتکار کا نام وقت ہے۔

فلیش بیک میں ایک اور چہرہ اُبھرتا ہے۔ اس سے چھوٹی عُمر کا بچّہ ہے جو چپس بیچتے ہوئے کہہ رہا تھا ــــ باجی ایک پیکٹ لے لیں صرف ایک روپے کا ہے"۔

مجھے راستے میں چیزیں کھانا پسند نہیں ــــ اس لیے انکار کر دیتی ہوں اور پوچھتی ہوں۔

تم نے خود بھی کبھی کھائے ہیں چپس ؟

نہیں جی!

کمال ہے بابا ــــ تم خود نہیں کھاتے اور دوسروں کو ....."

میرا جملہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ آنکھوں میں حسرت چھلکتی ہے اور دوسرے لمحے غائب ہو جاتی ہے۔ بچّہ مُسکرا کر جواب دیتا ہے۔

"باجی میں بابا نہیں امجد ہوں ــــ اور ــــ آپ لوگ جو کھا لیتے ہیں"۔

تب مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہم بڑے چپس نہیں بلکہ ان معصوم ذہنوں اور روحوں کو کھا لیتے ہوں ــــ میں یہ سوچ کر کانپ گئی ــــ مجھے اس کی معصومیت اور حُسن سادگی پہ پیار آیا ــــ بہت زیادہ پیار ــــ

"بیٹا! ایسا کر یہ روپیہ لے لو اور سمجھنا کہ باجی نے چپس کھائے

اُس نے روپیہ واپس کر دیا۔

باجی ــــ میں اس طرح پیسے نہیں لیتا ــــ امّی نے منع کیا ہے ناں اور پھر میں بھکاری تھوڑا ہی ہوں۔ مزدوری کرتا ہوں جی ــــ مزدوری ــــ صبح پڑھتا ہوں سکول میں ــــ پچھلے سال میں فرسٹ آیا تھا۔ لیکن اب اکبر فرسٹ آئے گا ــــ اُس کے ابّا بڑے افسر لگے ہیں اور انہوں نے مس کو ..... آپ چپس لیں گی ؟

اپنی عُمر سے بڑی باتیں کرنے والے کو میں نے زندگی کی دعا دی تھی اور اُس کی پیشانی چوم لی تھی۔ تب مجھے احمد شمیم کی وہ نظم یاد نہیں تھی۔ جس میں خوبصورتی کی ــــ پرندوں پر نظم لکھنے کی کی بات ہے۔ دُور کی جھیلوں میں بسنے والے اپنوں کی بات ہے۔ آنگن میں اُترنے والے نئے دِن کی مسافت جب کرن کی ساتھی بنتی ہے تب ان جگنوؤں اور تتلیوں کے دیس میں جانے والے فرمائش کرتے ہیں۔

امّی! ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو!

واپسی

مجھے اپنے اردگرد کوئی شے گھومتی ہوئی نظر آئی۔ جیسے کوئی صدا کوئی خوشبو بھٹک رہی ہو۔ بہت تلاش کیا مگر بے سود۔ ایسا اب سے پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔ بعض اوقات دفتر میں کام کرتے ہوئے بھی یہی مانوس مہک اور پراسرار صدا مجھ پر غالب آجاتی۔ میں اپنے آس پاس دیکھتا مگر مایوسی میرا مقدر بنتی۔ دوستوں کی محفل میں بات کرتے کرتے میں یکایک خاموش ہو جاتا۔ جیسے اُس نے میری قوتِ گویائی سلب کر دی ہو۔ دوستوں کی حیران حیران آنکھیں میرے چہرے پہ گڑ جاتیں۔ بہت سے سوالیہ چہرے میرے تعاقب میں رہتے ایسے میں اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا اور کبھی کبھی تو ندامت میرے ماتھے پہ پسینے کے چند قطروں سے عیاں ہو جاتی جسے چھپانے کی میں ہر ممکن کوشش کرتا مگر لاحاصل۔

ایک روز دفتر سے گھر جاتے ہوئے خوشبو کے لطیف احساس اور خوبصورت آواز نے میری سماعت کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ چونک کر میں پیچھے مُڑا تو جیسے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ایک وجود ایک حقیقت میری نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ کون تھی؟ وہ آواز مجھے کھوج رہی تھی مگر من موہنی سی پیاری لڑکی میرے لیے کتنی پرائی تھی۔ مجھ میں سمانے کے باوجود وہ مجھ سے اتنی دُور تھی کہ اسے چھو بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنے فاصلے پہ تھی کہ میں اسے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ کچھ دیر کے لیے میری پلکیں اپنا عمل بھول گئیں۔ میں خود فراموشی کی اس کیفیت میں جانے کب تک رہتا۔؟

مجھے یوں لگا جیسے اس کے پنکھڑی سے نازک لبوں نے مجھے الوداع کہا ہو — وہ خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح جانے کس سمت سے آتی اور پھر کس دیس چلی جاتی میں حیرت سے اسی راستے پہ دیکھتا رہ گیا جہاں چند لمحے پہلے زندگی تھی مگر اب خاموشی صرف خاموشی۔

میں اس کی تلاش میں ان راہوں پہ جانے کب تک بھٹکتا رہا۔ شائد وہ مل ہی جائے۔ میں

چاہتے ہوئے بھی اپنے ذہن کے ان دریچوں کو بند کر سکتا تھا جن سے اس کی یاد کی کرنیں گزرتی تھیں۔ میں ذہنی طور پہ بہت مضطرب رہنے لگا تھا۔ آہستہ آہستہ میں اپنے بہت پرانے اور عزیز ترین دوستوں سے بھی جدا ہوتا گیا یا پھر یوں کہوں کہ میرے رویے سے تنگ آکر انہوں نے خود ہی مجھ سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ دفتر کی مصروفیات ہر پل میرا دل جلاتیں مگر جہاں مسئلہ روٹی کا ہو وہاں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میرے گھر والے مجھ سے کوسوں دور رہتے تھے۔ میں ایک معمولی سے گھرانے کا فرد تھا۔ میرے والد نے میرے نام کونسی جائداد چھوڑی تھی جس پہ مجھے عیش کرنے کا موقع ملتا۔ میرا باپ تو ایک معمولی کسان تھا۔ کھیتوں میں ہل چلا کر ہم سب کا پیٹ پالتا تھا۔ ہمارا سات افراد پہ مشتمل کنبہ تھا۔ میرے والدین کے علاوہ ہم دو بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ والد نے جیسے تیسے کر کے دو بیٹیوں کے بیاہ کر دیئے تھے اور ہمیں بھی حسبِ توفیق زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا تھا۔ تیسری بہن کی شادی ہم دونوں بھائیوں کے ذمے تھی۔

جس روز میں اپنی پہلی کمائی لے کر ان عظیم ہستیوں کے پاس پہنچا جو دولت کی بھاری دُنیا کے لیے بہت کم حیثیت اور چھوٹے لوگ تھے مگر میری کُل کائنات وہی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میری پہلی خوشی میرے والدین کے لیے آخری خوشی ثابت ہوگی۔ میں جب اپنے گھر میں اس کچی مٹی کے آنگن میں پہنچا تو میرا باپ اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ وہ چند آخری سانسیں اپنے جسم کی گرفت میں لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے ہی میرے باپ کے ہاتھوں سے زندگی کی چند ساعتیں بھی رخصت ہو گئیں اور میں کچھ بھی نہ کر سکا سوا اس کے کہ اپنے والد کو اپنے ہاتھوں لحد کے سپرد کرنا پڑا۔ اس مٹی کے سپرد جس مٹی نے میرے باپ کو روزی دی۔ جس مٹی پہ کل میرے باپ کے قدموں کے نشان تھے پھر اس کے تھکے اور کمزور قدموں کی وہ چاپ بھی اس زمین نے سنی جب اس نے آخری بار اس دھرتی پہ بیج بویا تھا۔ کل اور آج کتنا مختلف تھا۔ کل میرے باپ نے اس مٹی سے اناج پیدا کیا اور آج اس مٹی نے میرے باپ کو اپنی گود میں خاموشی سے بھر لیا۔ پھر اسی ظالم مٹی نے میری ماں کو بھی اپنی بانہوں میں جکڑ لیا اور میں خاموشی سے صرف

دیکھتا رہ گیا۔

اسی زمین کی محتاجی ہمارے حصے میں آئی تھی۔ یہ وہی زمین تھی جس نے میرے بھائی کی جھولی میں اناج بھر بھر کے ڈالا تھا اور گھر کا نظام چلنے لگا۔ میرا بھائی مجھ سے بڑا تو نہ تھا لیکن گاؤں کے رسم و رواج نے اسے مجبور کر دیا اور وہ اپنی خالہ زاد منگیتر کو بیوی بنا کر اس کچے آنگن میں لے آیا۔ ماں باپ کی کمی ہمیں ہر پل محسوس ہوتی۔ خوشی کے بے رحم لمحوں میں سارے سوئے ہوئے زخم جاگ اُٹھتے ہیں۔ بہن کی شادی میں بھی ماں باپ کی کمی کا احساس شدت سے ہوا اور کئی مرتبہ میں بے بس ہو کر اپنی نم آنکھوں کو پونچھنے کی کوشش کرتا دکھائی دیا۔ پھر اس کچے آنگن کو پکی حویلی میں بدلنے کا خواب لے کر میں شہر آگیا۔ یہاں میں نے بہت محنت کی۔ دن رات محنت اور علم کی تلاش میں مصروف رہتا۔ اس کا صلہ مجھے اچھی نوکری کی صورت میں ملا۔ مگر انسان خود غرض اور حریص ہوتا ہے اسی سبب میں اپنے گھر والوں کے، اپنے سپنے سچ کرنے کی خاطر بہتر سے بہتر کی تمنا میں الجھتا چلا گیا۔ ان الجھنوں میں ایک نئی الجھن کا اضافہ مجھے پریشان کر رہا تھا۔

مگر اس الجھن میں میری ذات کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ تو کوئی انجانا جذبہ تھا جو مجھے اس کی جانب کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ لفظ جھوٹ بول سکتے ہیں مگر وہ جذبے جھوٹ نہیں ہوتے جن کی جڑیں ہمارے دل و دماغ ہمارے جسم و جان میں پھیلی ہوں۔ شائد یہی جڑیں مجھے اس کی تلاش پہ اکسا رہی تھیں وہ جس کے بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم تھا —— کون تھی —— کہاں رہتی تھی ——؟

وہ مجھ پہ اسقدر اثر انداز کیوں ہو رہی تھی ——؟ اس کے علاوہ بہت سے سوال تھے جن کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ شائد کسی اور کے پاس بھی نہ ہوگا۔ میں اس کے بارے میں جتنا زیادہ سوچتا اتنا ہی زیادہ الجھتا جاتا۔

میں دن رات راستوں پہ سفر کرتا تھا۔ سردیوں کی ٹھنڈی راتیں۔ گرمیوں کی خنک شامیں، تپتی دوپہریں۔ خزاں کی اُداسیاں۔ بہار کی دلفریبیاں۔ سبھی موسم۔ زندگی کے سبھی لمحے ایک سے لگتے۔ بے مقصد اور بے معرف زندگی میں سفر تو تھا جس نے برسوں میرا ساتھ دیا۔ موسموں کے

بکھرنے اور نکھرنے کے سلسلے چلتے رہے مگر میری زندگی اسی ایک نقطے پہ ٹھہر کے رہ گئی اور زندگی جیسے گزرتے گزرتے برسوں کے لیے رُک سی گئی کسی کے انتظار میں یا کسی کی تلاش میں میں نے اپنے وجود کو کسی کی امانت سمجھ کے سنبھال رکھا تھا۔

ایک روز یونہی راستوں پہ چلتے چلتے وہی خوشبو جواب کہیں کھو چکی تھی۔ وہی صدا جس میں لہجے کی شکست نمایاں ہو چکی تھی — مجھے وہ نظر آئی — اب میں خود کو مزید سُلگانا نہیں چاہتا تھا۔ شائد اس لیے بلا ارادہ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ ایک چھوٹے سے گھر میں داخل ہو گئی۔

نیم وا دروازے سے مفلسی جھانک رہی تھی۔ میں نے ایک پل کو اس کی سہمی سہمی شرمسار نگاہوں کو دیکھا اور پھر اس گھر کو جس میں سبھی کچھ تھا جانے وہ محبت کیا ہوئی؟ میرے دِل میں اندھیروں کی اس نگری کو چھوڑ کر جانے کیوں اس بستی کی جانب برسوں بعد لوٹنے کا خیال آیا۔ جہاں میرے بزرگوں کی پناہ گاہ تھی جہاں میری مٹی تھی۔ شائد وہ میرا گناہ معاف کر دے اور مجھے پناہ دے دے۔ اسی سوچ کے سہارے میں اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا — جو دروازے سے لگی اس کے گھر سے اتنی ہی دور تھی جتنی کہ میرے باپ کی قبر —

تعویذ

گھر کے تندور میں روٹی پکاتے ہوئے آج پھر اس کا دوپٹہ جل گیا تھا بلکہ دوپٹہ ہی نہیں وہ تو ساری کی ساری جل چکی تھی جانے کیوں ایک ایک کر کے اس کے سارے دوپٹے جلتے گئے تھے اور ماں کے خوف سے وہ ان جلے ہوئے دوپٹوں کو کبھی اپنے پرانے کپڑوں کی گٹھڑی میں چھپانے کی کوشش کرتی اور کبھی بکسوں کے کھُدروں میں مگر پھر بھی جانے کیسے ماں کو خبر ہو ہی جاتی۔ اس کا پہلا دوپٹہ اس روز جلا تھا جب اس کی سہیلی نے پہلی بار اسے ایک لوک داستان سوہنی مہینوال سُنائی تھی۔ زندگی کے دریاؤں میں وقت کی ہر سوہنی برسوں سے ڈوبتی رہی ہے اور ڈوبتی رہے گی، مہینوال کا انتظار ملاپ کی سرحد تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس نے ایسی ہی کئی اور داستانیں بھی سنیں مگر جب بھی ملن کی بہاروں میں وچھوڑے کی بات آتی وہ پہلے سے کہیں زیادہ حساس ہو جاتی۔ اُداسی کے جال میں اس کا اپنا آپ کب آن پھنستا تھا۔ یہ اسے ٹھیک سے یاد ہی نہیں تھا وہ اس پت جھڑ کے موسم کا سوچنا تو نہیں چاہتی تھی مگر یہ سوچ زبردستی ہی اس کی عادت بن گئی تھی۔ کیا سبھی لڑکیاں جب ان کہانیوں کے یاد رہنے والے کرداروں کا سوچتی ہیں تو ان کے دوپٹوں کو آگ لگ جاتی ہے — جن کی مہک سینے جلنے جیسی ہوتی ہے۔ جانے اس کا نام کیا تھا —؟ اگر وہ جانتی تو اس کی تلاش میں یوں اپنا وقت ضائع نہ کرتی، کسی نے کبھی اس کا کوئی نام ہی نہیں لیا تھا، تو اس میں بھلا اس کا کیا قصور؟ جو پکار وہ برسوں سے سنتی آئی تھی وہ تو ان لبوں کی ضرورتوں کی پکار تھی۔ اس کا نام اس میں شامل ہی کب تھا۔ نام کی جگہ بھی کام اور ضرورتیں ہوتیں نام کی کھوج کی وجہ تو وہ اجنبی تھا جس نے انجانے میں اس کا نام پوچھا تھا اور وہ کتنی ہی دیر تک حیران حیران آنکھوں سے اسے دیکھتی چلی گئی تھی پھر تو آنے والی ہر گھڑی میں یہی سوال زندگی کے راستوں پر چوراہوں کی سُرخ بتی بن کر کھڑا ہوتا ہے۔ سوال کبھی چیخ بنتا اور کبھی پیار سے، حسرت سے اسے اپنی طرف آنے کو کہتا۔ ہر جگہ اس کا پیچھا کرتا۔ اس سے اپنا آپ چھڑوانے کے لیے ہی تو اس نے آنکھوں کے اس سوال کا جواب

ماں سے مانگا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے ماں نے کیا ہو۔

پگلی! تجھے نام کی کیا ضرورت؟ لڑکیوں کے نام تو گھاس کے تنکوں کی طرح ہوتے ہیں یا پھر کاغذ کے ان ٹکڑوں کی طرح جو بارش میں بھیگتے ہیں اور بہہ جاتے ہیں۔ اگر بارش نہ ہو تو مُنہ زور ہواؤں کی سازش کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تیری مجبوریاں، تیری ضرورتیں تو ہزاروں ناموں سے زیادہ بڑی، کہیں زیادہ گہری اور پکّے رنگوں کی طرح ہیں۔ ان بے کار سوچوں کو اپنے پاس نہ آنے دینا۔ یہ تو چڑیلوں کی طرح کبھی نہ پیچھے ہٹنے کے لیے چمٹ جاتی ہیں انسان کا اندر باہر خاموشی سے کھا جاتی ہیں۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

اس کی زندگی میں ماں کی نصیحتیں پاؤں میں پڑی پائل کے گھنگھروؤں کی طرح ہمیشہ چھنکتی رہتیں، اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتیں آگے بڑھنے اور چلتے رہنے پہ اکساتی رہتیں مگر نام کی مشکل جھجکن بن کر راستوں پر پڑاؤ ڈال دیتی۔ نام نہ ہوا راستے کا پتھر ہو گیا کہ نہ لوٹنے پر رضامند اور نہ راستہ دینے کو تیار۔ اسے یونہی اپنے گاؤں کے کئی قصّے یاد آ گئے جو اس نے اب سے بہت پہلے کہیں سُنے تھے، محسوس کئے تھے۔ مگر تب وہ اس مفہوم سے واقف نہ تھی یہ سبھی حصّے یہ سبھی کہانیاں اس کے راستے میں اڑنے والی دُھول کی طرح تھیں۔ اسے اپنے نام کی فکر اپنے آپ سے بھی زیادہ تھی۔ اسی فکر کی وجہ سے زندگی اس کی دشمن بنتی گئی۔ دھڑکن نام ایسے پوچھتی جیسے کوئی سکھی سے ساجن کا نام پوچھتا ہو۔ کبھی تو اسے اپنے اندر ہیر نظر آتی، کبھی سوہنی، کبھی ستی، کبھی صاحباں، کبھی ماروی، کبھی لیلیٰ۔ جیسے اس کے اندر ایک عورت نہیں ہزار عورتیں رہتی ہوں۔ جن کی صورتیں وہ زندگی کے کئی لمحوں میں یوں اچانک دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ شادی بیاہ میں جب وہ لوگ گیتوں کے سُر بکھیرتی تو سُننے والے مسحور ہو جاتے اور وہ اجنبی شہزادہ ــــ وہ کبھی رانجھا بنتا، کبھی مہینوال، کبھی پُنوں، کبھی مرزا۔ کبھی ڈھولو۔ اور کبھی مجنوں ــــ جس سے ملن کے لمحوں میں بھی جُدائی کی دُھند اُسے گھیرے رہتی۔ اس کا جی چاہتا وہ ساری دُنیا سے جُدائی کی خاک اکٹھی کر کے اپنے سر میں ڈال لے تاکہ ساری جُدائیاں اُسی کی ہو رہیں۔ کوئی اور اس عذاب کو نہ جھیلے۔ مگر یہ تو اس کی سوچ تھی۔ کبھی ترنجن میں

بیٹھی ہوئی بھی وہ تنہائی کی پناہ میں ہوتی۔ اسے اپنے اس اکلاپے سے بہت پیار ہو گیا۔ وہ اسی انداز سے جینا چاہتی تھی۔ سب میں رہ کر سب سے کٹ کر، سارے لہجوں، سارے ذائقوں کو وہ اپنے خوابوں میں جمع کرتی رہی۔ ایک بوند اگر چاہے تو دریا بن سکتی ہے پھر کیا یہ بارش اور سیلاب کے رنگوں کا بھیس بدل کر نہیں آ سکتے۔ ایسی بارش، ایسا سیلاب جس سے آدمی کا اندر باہر بھیگ جائے مگر دیکھنے والوں کو پانی کا ایک قطرہ بھی نظر نہ آئے۔ سارے حرف نام بننے پر آتے تو آپس میں جنگ چھڑ جاتی۔ جیسے کبھی اسے چھوٹی کا نام ملا کبھی آپا کا کبھی بیٹی کا ــــ ابھی تو اور بہت سے نام بہت سے رشتے ملنا باقی تھے۔ وہی نام وہی رشتے جو ہر عورت کو بنا پوچھے، بنا چاہے اور بنا بتائے عمر کی راہ میں مل جاتے ہیں۔ بہو، بیوی ماں ــــ شائد انہی ناموں کی کشش نے ماں کو بھی متوجہ کیا تھا جبھی تو وہ گلی محلوں میں اس کی عُمر کے سارے اندھیرے سارے آنسو جمع کرتی رہی ــــ جیسے بچپن میں اس کے لیے کھلونے جمع کئے جاتے تھے۔ اس کے لیے تو جیسے سارے کھلونے ہمیشہ کچّی مٹی سے بنتے رہے تھے۔ جنہیں ٹوٹ کے بکھرنا ہوتا۔ اس کے جذبوں، اس کی سوچوں کو بھی مٹی کے کھلونوں جیسا سمجھا جاتا۔ جب چاہا خرید لیا ــــ توڑ دیا ــــ یا پھر باہر کوڑے میں پھینک دیا۔ ایسا کرنے والوں کو نہ تو کسی کے حال کی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی مستقبل کی۔ جانے اس کا مستقبل کیا تھا؟ اس کا مستقبل اس کے خواب تھے یا گھر والوں کے ــــ یہ بات وہ نہیں جانتی تھی۔ بس وہ اتنا ہی جانتی تھی کہ جس رانجھن کی وہ ہیر تھی وہ اسے بے پناہ چاہنے کے باوجود عُمر بھر کے بندھن میں نہیں باندھ سکتا تھا ــــ تو پھر کوئی اور ہی ایسا ہوتا جو اس کو اس بندھن میں باندھ سکتا۔ اس کوئی اور کی منتظر اس کی ماں بھی تھی اور وہ خود بھی۔ مستقبل کی یہی فکر اس کی ماں کو پیروں فقیروں کے ڈیروں پر لے جاتی رہی۔ کہیں سے دم کیا ہوا نمک لاتی مگر وہ بھی اس کے کسی کام نہ آتا۔ پھر ایک صبح اس کے ہاتھوں میں ماں نے کاغذ کا ایک پرزہ تھما دیا تھا ــــ اور کیا تھا ــــ

"سُن اسے کالے دھاگے میں پرو کر اپنے گلے میں پہن لے ــــ تعویذ کی طرح ــــ احتیاط سے پہننا اس طرح کہ کسی اور کو نظر نہ آئے ــــ خبر بھی نہ ہو ــــ بس چپ چاپ یہ کام کرنا"

ایسے چُپ چاپ کام میں ماں نے اوروں کے لاعلم رہنے کی بات کی تھی اس کے علم کی نہیں۔
اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے نصیبوں کی سیاہی جیسے کالے دھاگے میں پروئے ہوئے کاغذ کو پڑھے۔
اس کی عبارت جانے مگر وہ کیا کرتی ـــ؟ وہ پڑھنا کب جانتی تھی ـــ؟ صرف ماں کے سکھائے ہوئے
سارے سبق ہی عمر بھر پڑھتی رہی، یاد کرتی رہی ـ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ شائد مختلف صورتیں بدل بدل
کر کو نسا نام عمر بھر اس کے ساتھ چلتا رہا تھا مگر اسی خاموشی سے کہ اس کے قدموں کی چاپ بھی اس
تک نہ پہنچ پائی تھی ـ اس کے نصیبوں کی گٹھڑی کو تو جانے کن ہاتھوں نے اتنی پکی گرہ لگائی تھی کہ
کسی سے بھی نہیں کھُل سکی تھی ـ اس پر اسرار پُرزے کی مانند جس کی عبارت سے ناواقف ہونے کے
باوجود وہ اتنا جانتی تھی کہ کاغذ کا وہ ٹکڑا اس کی زندگی کی سب سے اہم ضرورت ہے جو اس سے جُدا
ہو گیا تو وہ مر جائے گی ـ

مرنے کی دعائیں تو وہ اپنی زندگی کی پہلی سانس سے مانگتی آئی تھی مگر اس موت کے لیے
وہ قطعی تیار نہیں تھی ـ جبھی تو وہ اسی سرمایۂ حیات کو ہر وقت اپنے سینے سے لگائے رہتی ـ ساری
یادیں بھولنے والی کو اس کاغذ کی یاد کبھی نہ بھولتی اور کھیتوں میں آتے جاتے ہی اسے چھُو کر مطمئن سی
ہو جاتی جیسے اس کے کھو جانے سے وہ خود بھی کہیں کھو جائے گی ـ اس کے جل جانے سے وہ خود
جل جائے گی ـ اس کاغذ کے بھیگ جانے سے مخفی عبارت کے دُھل جانے کا خطرہ رہتا ـ اس کی
حفاظت کرتے کرتے کئی سال ہو گئے ـ کالے دھاگے کا رنگ بھی بدل گیا ـ کالی روشنائی سے لکھے
گئے حروف بھی مدھم ہونے لگے ـ مگر وہ اسے اپنے آپ میں چھپائے پھرتی بلکہ اس کا اپنا آپ بھی کہیں
اس میں جا بیٹھا تھا ـ اپنے سارے خوابوں، ساری امنگوں سے بڑھ کر ـــ اپنی ماں کی جھڑکیوں سے بھی
بڑھ کر وہ اس کا خیال رکھتی رہی ـ

پھر ایک دن جب اس سے مل کر وہ ٹھنڈے کھُوہ سے لوٹ رہی تھی تب اسے لگا
جیسے وہ اپنا آپ بھی کھُوہ میں گرا آئی ہے ـــ جیسے اپنی موت کے کاندھے سے لگی سسک رہی ہو۔
عمروں کا حساب دینے بیٹھی ہو اور خالی ہاتھ ہو ـ اس کے سانسوں کی ڈوری شدتِ غم سے ٹوٹنے

لگی ـ پتہ نہیں راستے کے کس موڑ پر اس کا کالا دھاگہ ٹوٹ گرا تھا ـ جس میں گزرے برس اور اس کا
سہانا مستقبل پوشیدہ تھا ـ وہ اپنی تھکن اور شکست کے ساتھ پیچھے بھاگتی چلی گئی مگر سبھی راستے مٹی ہو
چکے تھے ـــ اس کا اپنا آپ بھی ـــ!

اس کا رانجھا نہیں جانتا تھا کہ آج کا ملاپ آج کی ملاقات اس کی آخری ملاقات ہو گی ـ
اس ملاقات کے دھنک رنگوں کو لیے جب رانجھے نے کھیتوں میں جانے کے لیے قدم بڑھائے تو کسی
چیز نے الجھ کر اس کی راہ روکنے کی کوشش کی اُس نے جُھک کر اُسے اٹھایا تو کالے دھاگے کی ٹوٹی
ڈوری اس کے ہاتھوں میں آ گئی ـــ!

فٹ پاتھ

وہ جب پہلی مرتبہ میرے پاس آئی تو اس کی جوتی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کسی ایک جگہ سے نہیں بلکہ بہت سی جگہوں سے۔ یوں لگتا تھا جیسے جوتی کی طرح اس کا دِل بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس وقت مجھے وہ کاغذ چُننے والی ایسی لڑکی لگی جو پھٹے ہوئے کاغذوں کے ڈھیر بنا کے اکٹھا کر کے گٹھڑی بناتی ہو اور خود بھی ان کاغذوں جیسی ہو۔ شائد وہ بہت دُور سے چلی آرہی تھی اور ابھی بہت دُور تک اُسے جانا تھا۔ سفر کی اس حالت میں جب کوئی چیز ساتھ چھوڑنے لگتی ہے چاہے وہ پاؤں کی جوتی ہی کیوں نہ ہو۔ اس کو اپنی منزل تک پہنچنے کی بہت جلدی تھی۔ شائد یہی وجہ تھی کہ تھکن اس کا راستہ روک رہی تھی .... کہیں وہ اپنے گھر تو نہیں جا رہی تھی ــــ؟ "گھر" ــــ اس کے گھر کا سوچا تو مجھے اپنے گھر کا خیال آگیا ــــ سب لوگ اسے اب بھی میرا ہی گھر کہتے ہیں۔ جس گھر کو میں چھوڑ آیا تھا وہ گھر..... بھی ایک گھر ہی تھا۔ میرا باپ بھی میری طرح جوتے مرمت کرتا تھا ایک عام سا موچی .... ! موچی جو دوسروں کے جوتے مرمت کر سکتا ہے۔ ان کا رنگ روپ بدل سکتا ہے مگر اپنی زندگی کے رنگ ڈھنگ کو بدلنا اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ تو اپنی زندگی کے ٹوٹے ہوئے سلسلے بھی نہیں جوڑ سکتا۔ کسی بھی جگہ سے ٹوٹی ہوئی جوتی وہ سی سکتا ہے لیکن قسمت کی لکیر کو کتنے ہی ٹانکے لگائے جائیں وہ ایک دِن بھی نہیں ٹھہرتے۔

میرا باپ بھی لوگوں کی تھکن اپنے ہاتھوں میں بھرتا رہا ان کے جوتوں سے ان کے سفر کے اندازے کرتا رہا اور اپنی زندگی کے سفر کو آسان بنانے کے خواب دیکھتا رہا۔ اپنی گونگی بیٹی اور بیمار بیوی کے لیے شفاء اور روشنی کے انتظار میں تھک کر وہ خود اندھیری قبر میں جا سویا۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گونگی بہن اس کی نہ ہو ــــ اندھی ماں اس کی نہیں میری ماں ہو ــــ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری ماں میرے گھر میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہوگی۔ میں اس شخص کی کہانی

سُن رہی تھی جس کی زندگی فٹ پاتھ پر گزرتی ہے جو اپنے پھٹے پرانے کپڑوں اور عجیب و غریب حلیے کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ جس کی آنکھوں میں وحشت اور تلاش ہے۔ اس کے چہرے کی اُداسی کسی دُکھی نظم کا عنوان نظر آتی تھی۔ وہ زنگ آلود چیزیں جمع کر کے لکڑی کے ایک ٹوٹے پھوٹے صندوق میں ڈالتا رہتا تھا ــــ وہ خاموشی سے ہر گزرنے والے کو دیکھتا رہتا ــ اس نے مجھے روک لیا تھا۔ مجھے ہی نہیں اس نے شام کی تصویر میں رنگ بھرتی زندگی کو روک لیا تھا۔

تم مہراں تو نہیں ہو ــــ؟ اگر تم ہوتی تو ــــ لیکن آج میں تمہیں بتائے بنا نہیں رہوں گا ــــ تم میری بات سنو گی ــــ تمہیں میری بات سُننا پڑے گی۔ کل شائد میں اس فٹ پاتھ سے ہی اُٹھ جاؤں اور ..... اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور دوسری بات کا سرا ڈھونڈنے لگا۔ جب خاموشی اس سے بچھڑ گئی تب وہ بولا ــــ

پتہ ہے میرا باپ ٹریفک کے ایک حادثے میں زخمی ہو گیا تھا اور پھر لاش کی شناخت نہ ہونے کے باعث لاوارث ٹھہرا اور پھر دفن کر دیا گیا اس کی لاش کی شناخت نہیں ہوئی تھی ــــ پھر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا تھا .... اس کی آواز بھی کھو گئی۔ کچھ دیر بعد اس کے ہونٹ ہلے اور ہلکی سی مدھم سی آواز میں وہ کہنے لگا ــــ پھر بھلا میری شناخت کیسے ہوتی؟ میں کوئی بھی نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس ہونے اور نہ ہونے کی دوہری کیفیت نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں کوئی بھی کام نہیں کر سکتا تھا ــــ کیسے کرتا ــــ؟ اگر میں زندہ ہوتا تو میرا کوئی وجود ہوتا۔ میرے موجود ہونے کا کوئی تو ثبوت ہوتا، کوئی حوالہ ہوتا۔ مجھے جنم دینے والی تو حیات تھی مگر میرے نام کا دوسرا حصہ ــــ مجھے اپنا آپ ایک گمشدہ کتاب کی طرح لگتا جسے کسی نے بھی ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔

میرا چھوٹا بھائی ہوٹلوں میں کام کرنے والے بہت سے چھوٹوں" میں سے ایک "چھوٹا تھا" جو ہمیشہ جھوٹے برتنوں کو دھوتا تھا اور خود بھی جھوٹا بن گیا تھا۔

دوسرا بھائی کارخانے میں کام کرتا تھا۔ ناکارہ پُرزہ بن کر دوسروں کے بگڑے کام بناتا تھا اور یوں ان کا کام چل جاتا تھا ــــ وہ بیچارا دوسروں کے لیے ہی زندہ تھا۔

میری ایک بہن بھی تھی ــــ جس کا ذکر ماں کسی کے سامنے نہیں کرتی۔ ہاں آدھی رات کو جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو سسکیاں اس کا نام پکارتی ہیں ــــ روشن، روشنے ــــ جو خود اندھیرا بن گئی۔ اب بھی وہ بھیانک خواب بن کر ہمیں ڈراتی رہتی ہے۔

مہراں بھی میری کب تھی؟ بھلا اونچے گھرانوں کی بیٹی بھی کبھی کمیوں کی ہو سکتی ہے۔ وہ دو تین مرتبہ میرے پاس ٹوٹی جوتی اور ٹوٹے لہجے کے ساتھ آئی۔ پتہ نہیں وہ اتنے لمبے راستوں پہ تنہا کیوں سفر کرتی تھی۔ اس کی جوتیاں بھی راستے کی سختی سے ٹوٹ جاتی تھیں۔ میں جتنی دیر اس کی جوتی مرمت کرتا اتنی ہی دیر تک اپنے ایک ایسے گھر کا خواب کھلی آنکھوں سے دیکھتا رہتا۔ وہ جب بھی آتی میری جھولی سنہرے سپنوں سے بھر جاتی۔ پھر جیسے وہ یہ بات بھول جاتی تھی۔ لڑکیاں سب کچھ کیسے بھول جاتی ہیں؟ اس کے ہونٹوں کا سوال اس کی آنکھوں میں اور اس کے دل پہ لکھا تھا۔ لگتا تھا یہ مشکل سوال کسی سے حل نہ ہو سکا تھا۔ اس نے سب سے یہی سوال کیا ہوگا؟ اس کے سوال کا جواب تو مہراں کے پاس بھی نہیں تھا ورنہ وہ جاتے جاتے اس سوال کا جواب تو دے جاتی ــــ شائد وہ سوال کا جواب دینا بھی بھول گئی ہوگی جس طرح وہ یہ بتانا بھول گئی تھی کہ ٹوٹی ہوئی جوتی کی جگہ ایک نئی تلے کی جوتی نے کس طرح لے لی تھی اور اب وہ ٹوٹی جوتی مرمت کروانے کی بجائے اس کو پھینک دینا کیوں پسند کرتی ہے ــــ پرانی جوتی کی جگہ نئی جوتی ہی کیوں خرید لیتی ہے ــــ مہراں بھول گئی یا بھلا دی گئی ــــ اس کا جواب کسی سے پاس بھی نہیں۔ موچی فٹ پاتھ چھوڑ کر کب کہاں چلا گیا یہ بھی کوئی نہیں جانتا ــــ سب سوالوں کے جواب گم ہو گئے ہیں یا پھر وقت نے گما دیئے ہیں ــــ!

ہم دونوں

میری آنکھوں میں ویرانی کے سائے دیکھتے ہوئے تم ڈر کیوں گئے رضا۔ کیا یہ ویرانی یہ اُداسی مجھے تم سے نہیں ملی۔؟ کیا میرے اس مرجھائے چہرے پہ تمہارے نام کی زردی نہیں ہے۔ تم جو کبھی میرے اپنے تھے۔ اپنے تو تم اب بھی ہو رضا مگر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ کبھی ہم ایک ساتھ رہتے ہوئے ایک ساتھ بیٹھتے ہوئے، ایک ساتھ سوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے اسقدر دور ہوتے ہیں۔ اپنائیت کے جذبے کے لیے راستوں کی فصیلیں فاصلے پیدا نہیں کرتیں۔ کوسوں دُور رہتے ہوئے بھی ہم کسی کو اپنے بہت قریب محسوس کرتے ہیں۔ کبھی ایک چھت تلے رہتے ہوئے بھی برسوں بیت جاتے ہیں مگر اپنائیت کی آنچ دلوں تک نہیں پہنچ پاتی اور کبھی جسموں کا ملاپ بھی ایک جھوٹ لگتا ہے۔ ہماری زندگی میں ذہنوں کی دُوری بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ ہمارے سبھی خواب اُس وقت ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں جب کوئی ہماری آنکھوں میں جھانک کر ایک ننھے سے شک کا کنکر پھینکتا ہے۔ تم نے بھی شُبہے کا ایک کنکر پھینکا تھا لیکن تمہیں کیا خبر اس کنکر نے میرے بدن میں کتنے سوراخ کئے۔ میری روح کو کتنے عذاب دیئے۔؟ میرے الجھے ہوئے ذہن کو اور بھی الجھا دیا۔ میں تو الجھنوں کے جنگل میں ایسی کھو گئی ہوں کہ باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی نہیں جو میرا ہاتھ تھامے۔ کوئی نہیں جو میرا نجات دھندہ ہو۔

ہم دونوں ایک ایسے بندھن میں بندھے تھے جس میں ہم ذہنی اور جسمانی دونوں اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب ہوں۔ جس کا پہلا تقاضہ اعتماد ہوا کرتا ہے۔ اسی اعتماد کے سہارے میں نے اپنے گھر والوں سے ٹکر لی۔ مجھے آج بھی وہ دن یاد ہے جب میں نے اپنی دہلیز پار کی تھی جب میں ان شفیق اور محترم والدین کی آنکھوں سے گرتے اشکوں اور صداؤں کو نظر انداز کر کے تمہاری ایک ہی پکار پہ انجانی منزل کی سمت چل پڑی تھی۔

مجھ سے نقشی رحمٰن سے وہ لوگ کیوں روٹھ گئے وہ نرم لہجے وہ میٹھی آوازوں کا سحر کیسے ٹوٹ گیا؟ کس نے ان مہربان والدین کی ٹھنڈی چھاؤں سے مجھے علیحدہ کیا۔ آج میں فگار پاؤں لیے اُن کے در پہ جاؤں بھی تو کیسے؟ اُس آنگن میں کیسے پاؤں دھروں جہاں اب میرے قدموں کے نشاں بھی نہ رہے ہوں۔ میں نے تو اپنی خوشی سے اس چھاؤں سے کڑی دھوپ کا سفر طے کیا۔

کیا تم جانتے ہو رضا اُن سب چہروں پہ میرے فیصلے نے دُکھ اور کرب کی وہ جھریاں ڈال دی تھیں جو کسی کو نظر نہیں آتیں اور جو عمر کے کسی بھی حصّے میں ساتھ نہیں چھوڑتیں۔

میں ایک غیر ملکی فرم میں ملازم تھی۔ میری اور تمہاری پہلی ملاقات بھی وہیں ہوئی اور پھر ایک طویل سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد وہ ہوا جو ہم نے چاہا وہ نہیں جو میرے والدین نے چاہا تھا۔ پہلے میں سمجھی کہ تمہارے گھر والوں سے تمہاری علیحدگی کی وجہ میں ہوں مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وجہ تم ہی تھے۔ تمہاری ضد اور غلط حرکتوں کی وجہ سے انہوں نے تمہیں گھر سے نکال دیا تھا جو اس وقت دونوں کی جانب سے ایک جذباتی فیصلہ تھا۔

جذبات اور خیالات کبھی پائیدار نہیں ہوتے یہ تو ہوا کے جھونکوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ہم نے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ قصوروار تو ہمیشہ عورت ہوتی ہے جب کہ تم بھی اس فیصلے میں برابر کے شریک تھے۔ مجھے بابا جان نے بہت سمجھایا تھا مگر میں تو کچھ سمجھنے کو تیار بھی نہیں تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

نقشی بیٹے کل تمہیں اپنے فیصلے پہ ندامت نہ ہو ممکن ہے تمہارا فیصلہ درست نہ ہو۔ اولاد اور والدین ایک دوسرے سے الگ ہو کر نہیں سوچا کرتے، تمہارا دکھ صرف تمہارا دکھ نہیں۔ جب اولاد کی آنکھ پرنم ہو تو بیٹی ماں باپ کی آنکھیں نہیں دِل رویا کرتا ہے۔ اُس کے ہونٹوں سے نکلی ہوئی سسکی کانوں میں زہر گھولتی ہے اور اندر ہی اندر آدمی ختم ہو جاتا ہے۔ کسی کو بھی علم نہیں ہوتا۔ والدین اولاد کے بہی خواہ ہوتے ہیں۔ دشمن نہیں ہوتے۔

حمّا نے بھی فیصلہ بدلنے کو کہا تھا اور آج بھی ان لفظوں کی بازگشت میرا پیچھا کرتی ہے۔

بیٹیاں امانت ہوا کرتی ہیں مگر تم کس انداز سے رخصت ہو رہی ہو۔؟ تمہارے اس فیصلے

اس فعل کا اثر ربیعہ پر بھی ہو گی۔ ہمارے ہر اچھے یا بُرے فیصلے کا اثر ہم سے وابستہ لوگوں پہ بھی پڑتا ہے۔ میں کل تمہارے چہرے پہ پچھتاوے کی لکیریں دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم ایک ایسے شخص کے لیے سب کچھ چھوڑ رہی ہو جس کے بارے میں ہم پُر امید نہیں ہیں ــــ تم پھر سوچ لو۔

مگر محبت سوچنے کا وقت ہی کب دیتی ہے۔ میری آنکھوں میں تو تمہارے خواب تھے۔ میرے اردگرد تو تمہاری باتوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے پھر میں کیسے اُن کی آنکھوں کے آنسو اور اُن کی نصیحتیں سُنتی۔ مجھے تو اپنی خوشی عزیز تھی۔ میں نے تو ربیعہ کی خاموش صدا بھی نہیں سنی تھی، میرا آنچل تھامے وہ خاموشی میں کیا کچھ کہہ رہی تھی۔

آپا! مت جاؤ۔ میں تمہارے بغیر تنہا رہ جاؤں گی۔ کیسے کہوں گی کہ لوٹ آؤ اب اُداسیوں کے گھنے سائے وحشتوں میں بدل گئے ہیں۔ حمّا کی دُعائیں بے اثر ہو چکی ہیں۔ بابا کی نظریں دروازے کے پار جاتی ہیں اور پھر مایوسی کا ہاتھ تھامے لوٹ آتی ہیں۔

آپا! ابھی تو میں نے ڈھولک کی تھاپ پہ سہاگ گیتوں کا راگ نہیں چھیڑا۔ تمہارے ہاتھوں میں مہندی کا رنگ نہیں چڑھا اور تم اتنی سادگی اور خاموشی سے پیا دیس چلی جاؤ گی۔ سب پکاریں گے مگر تم نہیں ہو گی۔ آپا لوٹ آؤ۔ میری ڈولی اتنی خاموشی سے نہیں اٹھے گی۔ تمہارے بغیر میں ڈولی نہ چڑھوں گی لیکن میں نے کسی کی بات نہیں سُنی۔ یہ کیسی رخصتی تھی جب کسی نے میرے ماتھے پہ بوسہ نہیں دیا تھا۔ میرے لیے کوئی بھی حرفِ دُعا نہ تھا اور میں اُن اپنوں سے اچانک رشتہ توڑ آئی۔

پھر ہم ایک ایسے رشتے میں بندھے جسے سماج میں عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جسے تحفظ اور مضبوط رشتے کی کلید سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے بیچ اس رشتے کو بندھے تین برس ہو گئے مگر تمہاری آنکھوں میں چھپی خوشی کی جھلک پہلے کیوں نہ دیکھی۔ کہیں تم مجھ سے تنگ تو نہیں آ گئے یا تم یہ جتلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ اب تمہیں میری ضرورت نہیں رہی کیونکہ میں تمہیں وارث نہ دے سکی۔ تم نے میرے متعلق یہ کیسے سوچا اور کیسے کہا کہ ــــ "جو عورت مجھ ایسے شخص کی جھولی میں گر سکتی ہے"

کسی اور کے لیے بھی یہی کچھ کر سکتی ہے۔" جب اظہار کا کوئی اور راستہ نہیں ملا تو میری آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ بہے مگر تمہارے نزدیک میری یہ گواہی بھی معتبر نہ تھی اور تم کہہ رہے تھے۔

مگر مچھ کی طرح آنسو نہ بہاؤ۔ میرے لیے کھانا لاؤ، بہت بھوک لگی ہے۔

میں کس کے لیے دن بھر کام کرتا ہوں، بھوکا مرتا ہوں اور نتیجہ ——؟

تم اتنے خود غرض کب سے ہو گئے رضا۔ کیا بات صرف تمہارے کام کی ہے۔ تمہاری ہی بھوک کا مسئلہ ہے —— ہاں —— مرد تو ہمیشہ بھوکا رہتا ہے —— میں جو دن بھر دفتر میں جھک مارتی ہوں وہ کس کے لیے —— ظاہر ہے تمہارے لیے، اس گھر کے لیے میں نے کیا نہیں کیا؟

جسے تم کرنا کہتی ہو نقشی وہ کام تو ہر لڑکی کر سکتی ہے —— تمہیں تحفظ درکار تھا اور میری ضرورت ایک خادمہ ایک جوان جسم کی تھی۔ ہم دونوں نے اپنی اپنی ضرورتوں کا سودا کیا ہے، میں اتنا بیوقوف بھی نہیں کہ گھاٹے کا سودا کروں، چاہو تو احسان سمجھو —— یہی بہتر ہے۔

رضا یہ جو میں نے در در کی ٹھوکریں کھائی ہیں یہ کس لیے —— آخر مجھے کیا ملا؟ تمہیں رنگ رنگ کے لوگوں کو ملنے کا چسکا ملا۔ تم نے ہر قدم پہ اپنی قیمت وصول کی ہے نقشی بیگم! رضا جو سزا چاہے دے لو لیکن مجھ پر الزام مت لگاؤ۔ اگر نفرت کرتے ہو تو صاف لفظوں میں کہہ دو۔ جھوٹے بہتان کی کیا ضرورت ہے ——؟

آنکھوں سے دیکھ کر بھی اعتبار نہ کروں؟

کبھی کبھی جو ہم دیکھتے ہیں وہ سچ نہیں ہوتا۔ تم نے آخر ایسا کیا دیکھا؟

کل تم سلمان صاحب کے کمرے میں کیا کر رہی تھیں؟

کیا تم نہیں جانتے کہ وہ اس فرم کے مالک ہیں۔ میں اُن سے تمہاری ملازمت کے سلسلے میں بات کرنے گئی تھی۔ تمہیں وہ ایک معقول ملازمت کی پیش کش کریں گے۔ مگر تمہیں تو وضاحتوں کی ضرورت ہے تمہیں خود پہ اعتماد نہیں تو مجھ پہ کیسے کرو گے؟

یہ جو تم دفتر سے چھٹی ہونے کے گھنٹے بھر بعد گھر پہنچتی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

رضا جب شک کا پودا جنم لیتا ہے تو یہ بانس کے پودے کی طرح راتوں رات بڑھ جاتا ہے۔ اندھی آنکھیں اس شک کو نہیں دیکھتیں مگر آپ ہی آپ شک یقین میں بدل جاتا ہے۔

میں نے تم سے یہ جھوٹ ضرور بولا تھا کہ میں بس میں آتی ہوں۔ میں بس میں نہیں .....

ہاں —— آپ تو گاڑیوں میں آتی ہوں گی۔ رضا نے طنز کا ایک اور تیر پھینکا۔

پہلے میری بات سُن لو پھر جو چاہو کہہ دینا —— میں روز دفتر سے گھر پیدل آتی ہوں۔ میں نے وہ رقم کہاں خرچ کی یہ بھی تمہیں بتا دیتی ہوں۔ میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ رقم پس انداز کر کے تمہارے گھر والوں کو منی آرڈر کرتی رہی ہوں —— اپنے نہیں تمہارے نام پر —— چاہو تو رسیدیں دیکھ لو —— چونکہ تمہارے اپنے وہم کے دریچے بند پڑے تھے اس لیے تمہیں اُن کی باتیں یاد رہیں۔ صدیوں سے ان دریچوں میں قفل لگے ہیں جنہیں تم نے کھولنا نہیں چاہا۔ تم اپنی غلطی تسلیم نہیں کرو گے۔ تم ہارنا کب چاہو گے؟ پھر جیت کس کی ہو گی ——؟ ہاں اگر تم اسے جیت مانتے ہو تو تم جیت گئے اور میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں عمر بھر کی پونجی ہار گئی —— میں ہار چکی ہوں ——۔

اے رب سچے
کیسا مجھ پہ ظلم ہوا
میں نے کن لوگوں کی خاطر
اپنے آپ کو بیچ دیا ——!

زنجیریں

عالیہ ان میں اور اُن عورتوں میں کیا فرق ہوتا ہے؟

کچھ بھی تو نہیں۔ میں نے بہت سچائی سے غزالہ کو جواب دیا تھا۔

وہ بھی مُسکرا کر ہاتھ بڑھا کر رقم وصول کرتی ہیں۔ جب رقم ہتھیلی سے پرس میں منتقل ہوتی ہے تب مسکراہٹ کی جگہ تلخی لے لیتی ہے اور خندہ پیشانی کا ثبوت دینے والے ماتھے پہ شکنیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ لفظ زہر میں بجھے تیر بن کر زبان سے نکلتے ہیں اور اندر باہر جیسے چھلنی ہو جاتا ہے مگر انہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ حیرت ہے انہیں اپنے رویے پر ندامت بھی نہیں ہوتی۔

ہاں تم ٹھیک کہتی ہو !

آج پھر میں مہینے بھر کی محنت کا معاوضہ وصول کر کے آرہی ہوں۔ ابھی جا کر اُس عورت کی ہتھیلی کا سوال پورا کروں گی جو میری ماں کہلاتی ہے — لیکن وہ ماں کم اور — زیادہ لگتی ہے۔ میرے ایک اک مسام کا معاوضہ وصول کرنے والی بھلا وہ ماں کیسے کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کی تو صرف آنکھ ہی سوالی نہیں بلکہ وہ تو ساری کی ساری — سر سے پاؤں تک سوال بن جاتی ہے اور میں ہی — اکیلی اس کے سوال پورے کرنے کی سزاوار ہوں۔ چند روز تو اچھے گذر ہی جاتے ہیں اس کے بعد تلخی اور غصہ۔ زہر ہونٹوں کے باہر آنے لگتا ہے۔ اس کا منہ بند کرنے کے لیے میں پھر مہینے کی پہلی تاریخ کا انتظار کرنے لگتی ہوں۔ وہ کب تک میری ہڈیوں کا سودا کرتی رہے گی — ؟ کب تک میں کھانا پینا چھوڑ کر خود کو کھاتی رہوں گی — آخر کب تک — ؟ جب وہ مرے گی تو کسی مرد کی ماں اُس کی جگہ لے لے گی اور یہ سلسلہ جاری رہے گا — یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے — پھر — پھر کیا ایک دن میں بھی اپنی بیٹی کی حرام کمائی حلال کرنے لگوں گی — تاکہ اسے بھٹی میں جھونکنے کے لیے لکڑیاں اکٹھی کر سکوں، ہماری مائیں بھی تو مجبور ہیں یہ سب کچھ کرنے کے لیے — اگلے لڑکی کے ساتھ

ڈھیروں جہیز کا مطالبہ جو کرتی ہیں۔ یہ جو اتنا جہیز جمع کرتی ہیں نا مائیں ـــ یہ جہیز نہیں وہ لکڑیاں ہیں جو ہماری چتا پہ جلائی جاتی ہیں۔ پتہ نہیں یہ رواج کب ختم ہوں گے ـــ؟ یہ وقت کب بدلے گا؟ کچھ کہو ناں ـــ کہتی کیوں نہیں تم ـــ عالیہ تم میری بات سُن رہی ہو ناں ـــ یا نہیں ـــ؟

غزالہ میرے پاس تمہارے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے ـــ پتہ نہیں ـــ آنے والے وقت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے ـــ؟

تو کیا ہم کسی شے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے ـــ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے ـــ نہ گزرنے والے وقت کے بارے میں کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی آنے والے وقت کے بارے میں۔ خاموشی کی زبان بھی کوئی نہیں سمجھتا۔ خدا بھی نہیں سمجھتا اور جانتا۔ لیکن چیخ کی پکار بھی تو کوئی نہیں سُنتا۔ ہم برسوں سے چیخ رہے ہیں اور یہ وقت گونگا بہرا بنا بیٹھا ہے ـــ۔

گھروں میں رہنے والیاں ہمیں آزاد سمجھتی ہیں۔ یہ کیسی آزادی ہے کہ ہم زنجیروں میں بندھے ہیں، یہ کیسی آزادی ہے کہ ہم اپنی مرضی اپنی خواہش سے کچھ خرچ نہیں کر سکتے، ایسا کیوں ہے، کیوں اور کب تک رہے گا؟

میرے پاس غزالہ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا کیونکہ میں خود بھی ایسی ہی آزادی میں جکڑی ہوئی ہوں۔ اس کی طرح میری ماں بھی میری قیمت وصول کرنے پہ مجبور ہے۔ فرق تو شاید کچھ بھی نہیں ہے ـ کل عورت کوٹھے پہ بکتی ہوئی نظر آتی تھی اور آج دفتر میں بکتی ہوئی تو نظر آ سکتی ہے لیکن بکتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ سب عورتیں کسی نہ کسی مقام پہ اپنی قیمت وصول کر رہی ہیں۔ سب عورتیں فروخت ہونے کے لیے ہی ہیں۔ خریدار کا چہرہ مرد جیسا ہے اور فروخت کرنے والے سب چہرے اردگرد پھیلے انسانوں کے ہیں۔ اُن عورتوں اور اِن عورتوں میں کوئی فرق ہے یا نہیں ـــ؟

ہاں کوئی فرق نہیں ـــ!

آوازیں

ٹیلفون کی گھنٹی کی آواز سُن کر وہ لڑکی چونک پڑتی۔ اس آواز کے ہاتھوں پریشان ہو کر ہی اُس نے محکمے والوں کو فون کاٹنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ کہیں دُور سے بھی اگر یہی آواز اُس تک پہنچتی تو جیسے اُس کے اندر باہر ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ایک ایسا شور جو اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ بارہا اُس نے خود کو اِدھر اُدھر مصروف رکھنے کی کوشش کی، آواز سُن کر انجان بنے رہنے کی اداکاری بھی کی مگر وہ اداکاری کامیاب نہ ہو پاتی۔ کسی ایسے فنکار کی طرح جو کیمرے کی سُرخ روشنی جلتے دیکھ کر اپنے مکالمے بھول جائے۔ اس کیفیت کو کوئی دوسرا شخص نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اسے جاننا اُس کے لیے ممکن ہے۔

آخری مرتبہ جب اُس گھر میں فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی تھی تو وہ فون اسی لڑکی کے لیے تھا۔ دوسری جانب وہ آواز تھی جسے سُننے کے لیے وہ برسوں زندہ رکھی گئی تھی۔ اُس آواز کو بوڑھے اور اپاہج وقت نے جو مکالمے لکھ کر دیئے تھے وہ انہیں سُننا نہیں چاہتی تھی۔ اُس روز کے بعد لڑکی نے کبھی فون ریسیو نہیں کیا۔ ہمیشہ اسے نظر انداز کر کے گزر جاتی جب کہ اُس کے ہاتھ اس کھلونے کو اٹھانے کی ضد کرتے اور بات نہ ماننے پہ بچوں کی طرح رُوٹھ جایا کرتے۔ تب وہ بھی کسی ماں کی طرح انہیں ڈانٹ کر خاموش کروا دیتی تھی۔

کسی سڑک یا گلی سے گزرتے ہوئے بھی وہ لڑکی یہ آواز سُن کر چونک جاتی۔ آواز سُنتی تب بھی اس کی حالت غیر ہونے لگتی اور نہ سُنتی تب بھی اُس کا خوف اُسے بے چین رکھتا۔ گھر والے اُسے ایک ماہرِ نفسیات کے پاس لے گئے۔ لڑکی کو اُس وقت شدید حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب اُس ماہرِ نفسیات نے بتایا کہ وہ بھی اسی مسئلے کا شکار ہے اور وہ خود بھی کسی دوسرے ماہر کے پاس مدد کے لیے جا رہا ہے تاکہ اُس کی مشکل آسان ہو جائے۔

لڑکی کو اب ہر آواز گھنٹی کی آواز لگنے لگی تھی۔ کال بیل اُس تک پہنچتے پہنچتے فون کی گھنٹی کی آواز میں

تبدیل ہو جاتی۔ زیورات کے استعمال سے بھی وہ گریز کرتی تھی حتیٰ کہ پاؤں کی جوتی بھی اس وجہ سے پہننی چھوڑ دی تھی۔ لوگوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر چکی تھی کیونکہ انسانی آوازیں بھی چند لمحوں بعد فون کی گھنٹی کی شکل اختیار کر جاتی تھیں۔ اسی آواز کی وجہ سے اُس نے گھر میں رہنا اور گھر سے باہر نکلنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔

لڑکی کو اُس کے وجود کا احساس بھی فون نے دلوایا تھا۔ پہلا اور آخری فون جو اُس کے لیے آیا تھا۔ ممکن ہے وہ فون بھی اُس شخص کا ہو جس نے لڑکی کے نام پہلا اور آخری خط لکھا تھا۔ کاغذ پہ صرف ایک ہی جملہ لکھا تھا۔

بانو! تمہاری آنکھ سے نکلا ہوا ہر آنسو تمہارے چہرے پہ نہیں آذر کے دِل پہ گرتا ہے!

بس ایک خط اور ایک فون نے اسے زندگی اور موت دی۔ فون کا معمہ حل نہیں ہو سکا کیونکہ وہ فون صرف اُس لڑکی نے سُنا تھا۔ پتہ نہیں وہ بانو تھی یا نہیں۔ کسی نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ سب لوگ تو اس کے متعلق سوچ رہے تھے کہ کہیں اُس کا چہرہ اُس شخص جیسا نہ ہو۔ جس کا ذکر لڑکی نے کبھی کسی سے نہیں کیا۔ ٹیلیفون کال جانے کس کی تھی ـــــ؟ اگر وہ لڑکی بانو نہیں تھی تو پھر وہ پریشان اور اُداس کیوں رہتی تھی ـــــ؟

بلاعنوان

وہ جانتا تھا کہ زندگی کے سارے لمحے نظم بننے کے انتظار میں زندہ ہیں اسی لیے وہ نظم لکھتا تھا۔ اُس کی نظموں میں کچھ ایسی بات ضرور تھی جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتی تھی۔ اس کی نظمیں بلاعنوان ہوتی تھیں بس نظم لکھ کر جیسے اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی نظم مانگتا تو وہ چھپنے کے لیے دے دیتا۔ اس کے پاس نہ تو اپنی کسی نظم کی کوئی نقل موجود ہوتی اور نہ ہی شائع شدہ نظم کا تراشہ اس کے پاس محفوظ ہوتا۔ وہ کم لکھتا اور کم چھپتا تھا۔ لوگ اس کی تحریر کے شدت سے منتظر ہوتے۔ ایک روز ایک لڑکی نے سوال کیا تھا۔

تم اپنی نظم پہ عنوان لکھنا کیوں بھول جاتے ہو ؟

اُسے محسوس ہوا تھا جیسے لڑکی نے اس کے بدن سے نہیں اُس کی آنکھوں سے نہیں اس کی روح سے بات پوچھی تھی۔ لیکن وہ سوال کا جواب نہیں جانتا تھا۔ عنوان بھول جانے کی عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ وہ اپنی محبوبہ کا نام بھی بھول چکا تھا۔ جس نظم کو کسی اور نے لکھا تھا اور جو اس سے کہیں گم ہو گئی تھی۔ جس طرح وہ اور بہت کچھ گُما دیا کرتا تھا۔ اپنا سگریٹ ماچس بھی اور کاغذ قلم بھی۔ اسی طرح وقت نے اس سے جانے کیا کچھ چھین کر اپنی مُٹھی میں چھپا لیا تھا۔

دوستوں عزیزوں نے مل جل کر اُس کا بیاہ کر دیا۔ جب اس کی بیوی نے اُس کی سوچ سے اُس کی مٹی سے نظمیں تخلیق کیں تب بھی وہ ان نظموں کو عنوان دینا بھول گیا تھا۔ ایک دِن تو وہ ان نظموں کے خالق کا نام بھی بھول گیا۔ جیسے برسوں پہلے اُس کا نام ہاتھ سے سکّے کی طرح گر گیا تھا۔ اُس دن کے بعد اُسے اپنا آپ بھی ویسا ہی لگا تھا۔ اُس کی اپنی نظم کا عنوان غائب تھا۔ پتہ نہیں چور وہی تھا یا کوئی اور ـــــ؟ کبھی لگتا ہے جیسے چور وہ لڑکی ہے جس نے عنوان بھول جانے کی بات کی تھی لیکن اس لڑکی کو بھی وہ برسوں پہلے اپنے دِل کی سیڑھیوں سے گرا کر زخمی کر چکا تھا۔ شائد وہ راستے ہی میں مر گئی تھی۔ اگر زندہ تھی تو کبھی نظر کیوں نہیں آئی تھی ـــــ؟

اگر مر چکی تھی تو کسی قبرستان میں اس کی قبر کا کتبہ کیوں نہیں تھا ـــــ؟

سایہ

میں نے جب پہلی مرتبہ شیدو کو دیکھا تھا تب اُس کا سانولا رنگ عجب لو دیتا تھا۔ جب دوسری مرتبہ میں اُس سے ملا تب یہ لو مدھم ہو چکی تھی۔ لگتا تھا اب یہ چراغ بجھنے کو ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی پہلی سی بات نہ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی اندھیرے کمرے میں اداسی اور تنہائی گلے لگ کے رو رہی ہوں مگر وہ میری آنکھوں کی بات ٹال رہی تھی۔ اس کا جواب دینے سے کترا رہی تھی۔ پہلے اس کی باتوں میں خوشی کے گھنگھرو بجتے تھے مگر اب خوشی کے سبھی گھنگھرو ایک ایک کر کے ٹوٹ گرے تھے۔ بس دُکھ کا بورنگ چمڑا باقی رہ گیا تھا۔

شیدو کا اصلی نام خورشید تھا مگر پھر وہ SHADOW بن کے رہ گئی۔ وہ اپنی ماں برکتے کے ساتھ پہلے پہل ہمارے گھر کام کرنے آئی تھی جسے دیکھتے ہی محلے بھر کے لڑکوں کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ اگر وہ کام کرنے والی مائی نہ ہوتی تو ممکن ہے کسی اچھے گھر کی مالکن ہوتی۔ مالکن بننے کے خواب وہ برسوں پہلے سے دیکھنے لگی تھی۔ بیگمات کے حُسن اور شان و شوکت سے وہ بہت جلد متاثر ہو گئی تھی۔ اسی لیے وہ ان کے چہروں کی جگہ اپنا چہرہ فٹ کر کے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھا کرتی۔ جھوٹے برتن اور میلے کپڑے دھوتے دھوتے وہ خود بھی ایک جھوٹا برتن اور میلا کپڑا بن کے رہ گئی تھی۔ مگر کسی نے اس کی آنکھ کا وہ ٹھہرا ہوا آنسو نہیں دیکھا تھا جو اس کی قسمت کے نقطے پہ آ کے ٹھہر جاتا تھا۔ شیدو اُسے ڈھلکنے نہیں دیتی تھی۔ ہر شخص اُسے اپنی سمجھ کے مطابق ہی جانتا۔ کچھ لوگ آنسو دیکھ کر انجان بن جاتے۔ کوئی اُس کے دوپٹے کے پلو سے نوٹ باندھ کر اُس کا سوال پورا کرتا اور کوئی مسکرا کے جواب دیتا۔ دراصل کسی نے اس سوال کو سمجھا ہی نہیں تھا۔ اسے صحیح طور پہ حل کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

شیدو کے لونگ کا لشکارا صاحب لوگوں کا مزاج اُس سے زیادہ پہچانتا تھا لیکن وہ خاموش ہی رہتا۔

شیدو کی آنکھ کا آنسو ایک دِن ایسا ڈھلکا کہ حیرت نے لوگوں کے چہرے بگاڑ دیے۔ اُس دِن کی زرد دھوپ میں اُسے علم ہوا تھا کہ برکتے کی برکت اُٹھے تو برسوں ہو گئے اور برکتے نے بھی جان لیا تھا کہ اُس کی شیدو کا خورشید کب کا غروب ہو چکا۔ دونوں برسوں بے خبر رہیں، انجان رہیں، ایک دوسرے کے اندر رہتے ہوئے بھی کتنی دُور رہیں یا شائد وہ دونوں ایک دوسرے سے چھُپ چھُپ کر اپنی اپنی میل دھو رہی تھیں!

کُنڈلی

چھوٹے چھوٹے باریک سانپوں سے سارا راستہ ڈھکا ہوا تھا۔ ہر طرف زہریلے سیاہ سانپوں کی خوفناک آوازیں پھیلی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سانپ نہ ہوں بلکہ کسی سڑک پہ جمی ہوئی وہ برف ہو جس کے پگھلنے کا انتظار بوڑھا وقت جانے کب سے کر رہا ہو۔ کئی سانپ وہ اپنے پیروں تلے کچل چکی تھی مگر موقع ملتے ہی سانپ اسے ڈسنے کی کوشش کرنے لگتے۔

رانی اِن خوابوں کو برسوں سے دیکھتی آ رہی تھی۔ بچپن میں بھی انہی خوابوں کی وجہ سے وہ نیند سے آنکھیں چُرانے لگی تھی مگر کب تک ؟ پھر خود ہی یہ خواب اُس کی زندگی کا حصّہ بن گئے۔ اُس کا مرض ڈاکٹروں، حکیموں کی شفا سے بہت آگے نکل چکا تھا جبھی تو اُس کی ماں کہیں سے تعویذ لے آئی تھی جس کی حفاظت اُس کی آنکھیں سوتے جاگتے میں آپ ہی آپ کرنے لگتیں اور پھر کرتی رہتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ نامحسوس طریقے سے آہستہ آہستہ وہ گھر والے اپنوں اور بیگانوں کے قرب اور محبّت کی پناہ سے دُور ہوتی گئی۔

اُس کے لیے ماں کی گود بھی کُنڈلی بن گئی تھی۔ باپ کی آنکھوں میں بھی سانپ کی آنکھوں سی چمک محسوس ہوتی۔ بہن کی مستانی چال بھی یوں لگتی جیسے سپنی بل کھا کے چلتی ہو۔ رانی کو تو اپنے آپ میں بھی سانپ کی پرچھائیں نظر آنے لگی تھی پھر جانے رانی کی ماں کے دِل میں کیا خیال آیا کہ اُس نے رانی کا بیاہ کر دیا۔ اس دِن بھی رانی نے یوں جانا جیسے وہ انسانوں کی بستی میں نہیں بلکہ سانپوں کے جنگل میں بھیجی جا رہی ہو مگر عجیب بات ہوئی کہ رانی نے اُس شام کے بعد خواب کہیں نہیں دیکھے تھے یا تو وہ راستے میں کہیں ٹھہر گئے تھے یا پھر اُس دھلیز سے رخصت ہوتے ہوئے ڈولی چڑھنے سے رہ گئے تھے پھر رانی کی زندگی سے خوابوں کا وہ اہم حصّہ کہیں کھو گیا۔ اُسے کب علم تھا کہ ایسے ظالم خواب بھی اپنی تاریخ دُہراتے ہیں۔ اگر وہ جانتی تو ان صفحوں کو کتاب سے علیحدہ کر دیتی یا پھر ان لفظوں سے وہ سیاہ بخت

چھین لیتی جو جیتے جی انسانوں کو مار ڈالتی ہے۔

برسوں بعد رانی کی بیٹی کی زندگی میں اپنی خوابوں نے ڈیرا ڈال لیا وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کہانی کا انجام کیا ہوگا؟ کب ہوگا؟ ہوگا بھی کہ نہیں ــــ؟ کہیں ایسا نہ ہو خواب کئی پشتوں تک اُس کا تعاقب کرتے رہیں۔ اس نوعیت کی کئی اور سوچوں نے اُس پہ خوف کی گہری چادر تان دی۔ جس میں وہ اپنا آپ بھول گئی۔ رانی کو ایک ہی بات یاد رہ گئی تھی جسے وہ زبان پر کبھی نہ لاتی مگر اُس کی آنکھیں .....!

کچھ لوگ کہتے ہیں وہ ہر زندہ عورت کو موت کی بددُعا دیتی ہے۔ عورتوں کا کہنا ہے کہ وہ دُکھی عورتوں کو سُکھ اور سکون کی دُعا دیتی ہے۔ شہر کی تمام لڑکیوں سے رانی کو نفرت اور ڈر کی بدبو نجانے کیوں آتی ہے؟ لڑکیاں اُس کے سائے سے گھبراتی ہیں۔ وہ اُس سے بھاگتی ہیں اتنی دُور کہ اُن کا سانس بے قابو ہو جاتا ہے اور وہ اِس کے خوابوں اُس کی باتوں پناہ مانگتی ہیں۔ اُس کو دیکھتے ہی یا پھر اُس کے متعلق سوچتے ہوئے لڑکیوں کے ہونٹ خدا کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ اُن کی آنکھیں سہم کر زمین کی ناہمواری دیکھنے لگتی ہیں۔ اُن کے جسم کانپ کر سمٹ جاتے ہیں۔ اُن کی جوانی شرمندہ ہوتے ہوتے آخر کار تھک جاتی ہے۔ اُن کے سارے خواب رانی کو دیکھ کر ڈھلک جاتے ہیں اور وہ اس کے سامنے برہنہ ہو جاتی ہیں جیسے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی سزا پانے کو تیار ہوں اور انہیں یقینِ کامل ہو کہ اس سزا کے بعد کی زندگی میں رانی سے اُن کی ملاقات ممکن نہ ہوگی اور وہ اس سے متعلق ہر بات بھی بھول جائیں گی!

خاموشی

نسبت روڈ پہ اُس نے رکشہ کو روکا اور اپنی منزلِ مقصود تک جانے کو کہا۔ ڈرائیور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ایک لڑکی کے ہمراہ رکشے میں سوار ہوا۔ لڑکی نے غالباً گیروے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو تاریکی میں اور بھی زیادہ گہرا نظر آ رہا تھا۔ دوپٹے نے اس کے سیاہ بالوں اور آدھے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

راستے میں اُس کی آواز مسلسل آتی رہی جب کہ لڑکی زیادہ تر خاموش رہی۔ اُس نے پوچھا ــــ

کیا اب تم بار بار بُلانے پر آیا کرو گی؟

لڑکی نے شائد اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور خاموش بھی رہی۔

پھر کب آؤ گی؟

پتہ نہیں ــــ محض لفظ بولے گئے تھے، مفہوم اور لہجے کی پرواہ کئے بغیر ــــ محض لفظ ــــ! پھر وہ خود ہی سوال کرتا رہا اور خود ہی جواب تلاش کرتا رہا۔

لڑکی کی خاموشی بے معنی نہیں تھی، بڑی پُراسرار تھی وہ موجوں کی طرح ــ جن کے اندر طوفان ہو، گہرا اور شدید طوفان۔ ٹریفک کے شور اور تاریکی میں اُس کی آواز دُوبتی ابھرتی رہی اچانک اسے احساس ہوا جیسے وہ خود سے یا دیوار سے باتیں کرتا رہا ہو۔ اُس کی آنکھوں میں خوف کا سایہ سا لہرایا۔ اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے اور شائد اپنے خوف کو شکست دینے کے لیے اُس نے نرمی سے لڑکی کا ہاتھ چھوا۔ ہاتھ اور لڑکی دونوں خاموش اور سرد تھے (کیا وہ پتھر کے بن چکے تھے؟)

راستے میں ایک مقام پر رکشہ رُکا۔ آخری مرتبہ اُس نے سوال کیا ــــ پھر کب آؤ گی ــــ؟

لڑکی نے جواب میں صرف اُسے ایک نظر دیکھا۔ اُس نے اسے اقرار ہی جانا۔ وہ یہی جاننا چاہتا تھا۔

اُس کا ہاتھ ایک پل کو ہوا میں رُکا اور پھر وہ جانے والے رکشے کو دیکھتا رہا۔ جس میں اب ایک تنہا اور خاموش لڑکی بیٹھی تھی۔ جانے کیا سوچ رہی تھی اُس پیچھے رہ جانے والے لڑکے کے متعلق یا اپنے طویل سفر آئندہ پیش آنے والے حادثات و واقعات کے متعلق ـــــ مگر افسوس ہم اس لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اُس کی زندگی کا ہر نیا لمحہ ایک نئی زندگی کا آغاز بھی کرتا ہے اور ـــــ خاتمہ بھی ـــــ!

رنگوں کی کہانی

عجیب بات تھی پہلے وہ لڑکی خود ہی شوق سے کانچ کی چوڑیوں سے اپنی کلائی بھر لیتی پھر رات کی تاریکی میں اپنے ہی ہاتھوں سے انہیں توڑ ڈالتی۔ اس کی گوری کلائی پہ ٹوٹتی چوڑیاں اپنے نشان چھوڑ جاتیں۔ اُسے ان نشانات سے بہت پیار تھا۔ اگر کسی دن وہ کلائی پہ کوئی نشان نہ دیکھتی تو پریشان ہو جاتی۔ پھر وہ نئی چوڑیاں پہنتی اور توڑ دیتی۔ ممکن ہے اُسے ٹوٹی چوڑیاں جمع کرنے کی عادت رہی ہو۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اُسے یہ عادت کب سے ہوئی؟ ممکن ہے ٹوٹی چوڑیاں کو جمع کرنا اس کا مشغلہ ہو جس طرح بچے ٹکٹیں جمع کرتے ہیں یا پھر تتلیاں ـــــ یا جیسے دیس دیس کے سکّے جمع کئے جاتے ہیں۔

اُس لڑکی کی کلائیوں نے ہر رنگ کا ذائقہ چکھا تھا اور سب کے ساتھ رہنے کے وعدے بھی کئے تھے۔ مگر ہاتھوں کی دیوار ہر رات وہ پکّے وعدے ٹو دیتی وہ بے بس ہو جاتی تھی۔ یادیں اور زخم اُس کی جھولی میں ڈال کر چوڑیاں جدا ہو جانے پہ مجبور ہو جاتیں۔ جب پہلی مرتبہ اُس کے بیاہ کی بات چلی تھی تو اُس نے اپنی گوری کلائی میں سُرخ رنگ پہننے کی کوشش کی تھی مگر یہ رنگ اُسے راس نہیں آیا اور پھر بدلتی ہوئی زندگی کی طرح چوڑیوں کے رنگ بھی بدلتے گئے۔ (جیسے کسی بھی آدمی کے خیالات بدل جاتے ہیں۔) جب زرد دوپہروں نے اُس کے چہرے کو اُداس اور آنکھوں میں نمی دیکھی تھی تب اُس کی کلائیوں نے بھی پت جھڑ کے موسم کا پیلا رنگ دیکھا تھا۔ بہار آئی تو اُس کی کلائی میں ست رنگی چوڑیاں تھیں۔ جب زندگی نے تخلیق کے انمول جذبے کو چھینا تو نیلا رنگ بھی اس سے چھن گیا۔ گیروا رنگ آیا اُسے تنہائی دے کر چلا گیا۔

لوگوں نے اُسے فقر اور فکر کے رنگ میں رنگے دیکھا مگر جلد ہی یہ سبز رنگ بھی اُتر گیا۔ اُس نے جانا جیسے وہ ساری عُمر رنگوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی رہی ہو اور کسی کو نہ پکڑ سکی ہو۔ کسی کو چھو کر نہ دیکھ سکی ہو۔ کسی کے اندر نہ جھانک سکی ہو۔ اُس نے شکست قبول کر لی اور ایک بے رنگی زندگی سے

سمجھوتہ کرلیا اب سفید رنگ ہی اُس کا دوست تھا مگر یہ دوستی بھی کچے رنگ کی طرح جلد پھیکی پڑ گئی۔

اچانک ایک دِن اُسے سب رنگوں سے نفرت محسوس ہوئی جیسے اُس کی زندگی میں انہی رنگوں کی سازش اور زہر گھُلا ہو۔ اپنے آپ سے وہ خوفزدہ اور سہمی سہمی رہتی۔ بتدریج وہ ان رنگوں سے ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی۔ روٹھتے وقت شائد آخری بات اُس نے جُدائی اور فاصلوں کی کی تھی پھر اُس کی آواز گہری چُپ میں تبدیل ہو گئی اور وہ خاموشی سے محبت کرنے لگی۔ پر اسرار خاموشی نے اُسے سیاہ رنگ پہ مائل کیا۔ پتہ نہیں کیوں وہ کالی چوڑیوں کو اپنے ہاتھوں سے نہیں توڑتی تھی لیکن عجیب بات تھی ہر صبح سورج کی روشن کرنیں اُس کے بستر اور کمرے کے فرش پہ کالی چوڑیوں کے ٹکڑے اور کرچیاں دیکھتیں، چُپ رہتیں اور اُس کے کمرے سے لاپرواہی کے ساتھ گزر جاتیں۔

پلیٹ فارم

۱۵۶۲۱۰ یہ ایک پلیٹ فارم ٹکٹ کا نمبر ہے جس پہ لکھا ہے کہ یہ صرف اُس گاڑی کے لیے کارآمد ہے جس کے لیے جاری ہوا۔ میں سوچ رہا ہوں یہ کہاں سے آیا ؟ مجھ تک کیسے پہنچا۔ ؟ جانے کس گاڑی کا ہے ؟ کسی ایسی گاڑی کا جو گزر چکی ہو گی یا پھر گزرنے والی ہو گی۔ پتہ نہیں اس میں کوئی آرہا تھا یا پھر جا رہا تھا۔

مجھے یہ ٹکٹ بُک شیلف سے ملا ہے۔ ممکن ہے کسی کتاب سے گرا ہو۔ مگر نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو آج تک اپنی کوئی کتاب اُس کے سوا کسی کو نہیں دی۔ لیکن وہ تو . . . . . ؟

اگر یہ کسی اور کے ذریعے یہاں تک پہنچا ہے تو پھر وہ کون ہے ؟ میرے ہی پاس ٹکٹ کیوں ہے ؟ جب کہ میں کبھی ریلوے اسٹیشن کے قریب سے بھی نہیں گزرا۔ میں تو بس یا ویگن کے اڈے سے بھی کترا کے ہی چلتا ہوں مبادا مجھے کہیں جانے کی خواہش نہ اپنی سمت کھینچ لے۔ مجھے کبھی بھر سفر کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں پیدل ہی آتا جاتا ہوں چاہے منزل میلوں دُور ہی کیوں نہ ہو۔ میں کسی کے پاس بھی شائد نہیں جاتا، کسی سے نہیں ملتا، کسی کے کام نہیں آتا۔ (دوسرے لوگ بھی کام نہیں آتے مگر وہ میری طرح اعتراف نہیں کرتے۔)

مجھے سفر کرنا پسند نہیں ۔ اس خیال ہی سے میرا دل بے قابو ہونے لگتا ہے اور چہرہ دُھواں دُھواں۔ مجھے ہر طرف سسکیاں سُنائی دیتی ہیں۔ دبی دبی سرگوشیاں مجھے پکارتی ہیں۔ آنسو بھری آنکھیں میرا تعاقب کرتی ہیں۔ الوداع کہنے کو کئی ہاتھ اُٹھتے ہیں اور پھر چوڑیوں کی جھنکار۔ رنگین آنچل کی مہکار۔ چادریں دوپٹے ۔ بُرقعے اور کئی تصویریں ایک ساتھ گڈمڈ ہونے لگتی ہیں۔ کسی فلم کی ریل تیزی سے چلنے لگتی ہے مگر وہ منظر نہیں بدلتا۔ مجھے جدائی کے خیال سے نفرت ہے، جذبوں کے اظہار سے نفرت ہے۔ ٹوٹنے بکھرنے اور سمٹنے کے عمل سے نفرت ہے۔ مجھے محبتوں

سے منافقت کی بو آتی ہے۔ ان عورتوں سے مجھے شدید نفرت ہے۔ میں نے کئی برس تک کچھ نہیں کیا صرف خوبصورت عورتوں کے جسم سے پیار کیا ہے اور یہ جانا ہے کہ عورت صرف وفا چاہتی ہے ــــ خود وفا کرنا نہیں جانتی (احمق عورتیں اپنے جسم کو سب سے بڑا ہتھیار سمجھتی ہیں اور جسم سونپتے ہوئے یہ نہیں جانتیں کہ وہ کیا کچھ کھو رہی ہیں۔)

میری ماں نے بھی ایک مدت تک میرے باپ سے وفا کا ڈھونگ رچائے رکھا۔ میری بہن نے بھی ماں کے پڑھائے ہوئے سبق کو دُھراتے زندگی گزار دی اور .... اُس نے بھی ایسا ہی کیا۔ میں نے شائد اُس کے ذکر کے لیے ہی ماں بہن اور دوسری عورتوں کا ذکر کیا۔ دوسری تمام عورتیں کسی سطح پہ بے قصور ہو سکتی ہیں مگر وہ نہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرے اندر کے آدھے انسان اور آدھے درندے کو جان گئی تھی۔ اُسے علم تھا کہ میں وحشت میں کچھ کر سکتا ہوں "کچھ بھی" پھر اُس نے خود کو مجھ سے کیوں نہیں بچایا؟ وہ تو سب کچھ کہنے اور سُننے سے پہلے جان لیتی تھی، سمجھ لیتی تھی پھر یہ بات وہ کیوں نہیں سمجھی کہ میں اگر اُسے پانے کے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں تو اُسے کھو دینے کے لیے بھی تو ــــ مگر وہ کیسے جانتی؟ جس طرح میں نہیں جانتا کہ یہ ٹکٹ میرے پاس کہاں سے آیا اور کیوں؟ میں تو اب بھی کبھی اُن راستوں سے نہیں گزرتا جہاں سے وہ گزرتی تھی۔ اس کے تو پیروں کے نشان بھی اب مٹ چکے ہوں گے۔ آخر وہ کیوں بار بار آجاتی ہے بلکہ ہر بار آجاتی ہے باتیں کرتے ہوئے کچھ سوچتے ہوئے ــــ زندگی کے درمیان چاک سے کھنچی سفید لکیر کی طرح وہ راستہ روک کے کھڑی ہو جاتی ہے ــــ یقیناً یہ وہی ہے جو ہمیشہ میرا راستہ روکتی ہے ــــ نہ مُڑنے دیتی ہے ــــ نہ پلٹنے کی اجازت دیتی ہے۔ نہ آگے بڑھنے دیتی ہے اور نہ ہی مجھے راستہ بدلنے کی ہمت دیتی ہے ــــ آخر وہ کیوں ہر جگہ میرا تعاقب کرتی ہے ــــ ہر وقت مجھے پریشان کرتی ہے ــــ نہ دن میرا ہے اور نہ ہی رات ــــ سارا وقت اُسی کا ہی ــــ سارا سحر اسی کا ہے ــــ میں اُسی کے خیال میں کھویا رہتا ہوں ــــ اُسی کی کائنات میں گم رہتا ہوں ــــ اُس نے تو میری ہستی بھی میری نہیں رہنے دی ــــ میرا ذہن میری سوچ سب کچھ اسی کا تابع ہے۔ سب کچھ ویسے

ہی ہوتا ہے جیسا وہ چاہتی ہے ــــ

میں ٹکٹ لے کر ریلوے اسٹیشن چلا گیا ہوں۔ چیکر نے کہا ہے یہ ٹکٹ تو بہت پرانا ہے۔ اب تو اس کے رنگ کو بدلے ہوئے بھی اور سکے کو تبدیل ہوئے بھی ایک عرصہ ہو گیا۔ کتنا عرصہ؟ چھ سات سال یا پھر اس سے بھی زیادہ ــــ تو کیا میں برسوں سے یہیں کھڑا ہوں۔ ایک ہی جگہ پتھر ہو گیا ہوں ــــ کیا یہی پلیٹ فارم میری منزل ہے ــــ کیا یہی میرا راستہ ہے۔ کیا میں کسی کا منتظر ہوں ــــ کس کا ــــ؟ پلیٹ فارم پر تو ریل گاڑی آتی ہے ــــ تو کیا وہ گاڑی نہیں آئی ــــ یا پھر آکر چلی گئی ــــ کیا وہ اب نہیں آئے گی ــــ کہیں وہ آکر واپس تو نہیں ــــ اور ــــ دیکھو ــــ سنو ــــ میری بات سُنو ــــ یہ چیکر مجھے اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہا ہے ــــ؟ جیسے میں کوئی مرا ہوا انسان ہوں ــــ یا جیسے غاروں سے نکل کے آیا ہوں ــــ کیا یہاں میرا کوئی نہیں ــــ؟ کیا میری بولی سُننے اور سمجھنے والا کوئی بھی نہیں ہے ــــ؟ میرے متعلق یہاں کوئی بھی کچھ بھی نہیں جانتا ــــ کیا کوئی میرے بارے میں کچھ سوچتا بھی نہیں ــــ لیکن کوئی اور جانے نہ جانے سوچے نہ سوچے وہ ضرور میرے متعلق سوچتی ہو گی ــــ ممکن ہے وہ بھی نہ سوچتی ہو ــــ تو کیا وہ مجھے نہیں پہچانتی ــــ وہ بھی مجھے نہیں جانتی ــــ جس کے لیے میں گمنام ہوا ہوں ــــ سب کے لیے انجان ہوا ہوں ــــ اجنبی ہوں ــــ لیکن اُس کے لیے تو اپنا ہوں ــــ وہ ضرور مجھے جانتی ہو گی ــــ جب کہ وہ تو سب کچھ جانتی تھی ــــ سب کچھ ــــ سب کچھ ــــ! کوئی آواز مجھے جھنجھوڑ رہی ہے۔ بہت مختلف لہجے میں کوئی چیخ رہا ہے۔ میں چونک کر اپنے اردگرد دیکھتا ہوں ایک عورت کھڑی ہے ــــ کہتی ہے ــــ کہاں کھوئے رہتے ہو ــــ؟ جلدی سے سامان ڈبے میں رکھواؤ ــــ تھوڑی دیر میں گاڑی چلی جائے گی اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے ــــ؟

میں محسوس کرتا ہوں کہ اُس بدصورت عورت کو دیکھتے ہوئے حیرانگی میری آنکھوں میں مٹی بن کر گھس جاتی ہے۔ مسلسل اجنبی آوازیں آرہی ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے؟ مگر وہ موقع نہیں دیتی یوں ظاہر کرتی ہے جیسے یہاں صرف میں ایک اُس کا اپنا ہوں، باقی سب اجنبی

اور پرانے ہیں۔ وہ جانے کہاں سے آئی ہے اور مجھ سے باتیں کیوں کر رہی ہے لیکن پھر مجھے گرد و پیش کی زندگی اپنے پاس بُلا لیتی ہے۔ میں بھولی بسری باتیں یاد کرنے لگتا ہوں اور کچھ دیر بعد جان لیتا ہوں کہ وہ اجنبی اور بدصورت عورت میری بیوی ہے مگر یہ جاننے سے اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ گھٹن، دُکھ میرے اعصاب کو متاثر کرنے لگتے ہیں۔ پس تھک کر فرش پہ گر جاتا ہوں۔ لیکن میں اب بھی اس کے پاؤں کے نشان نہیں مٹا سکتا۔ اُس کی آواز نہیں بُھلا سکتا اس لیے کہ وہ پہلی عورت تھی۔

پلیٹ فارم ٹکٹ میرے ہاتھ سے اُسی خاک آلود فرش پہ گر جاتا ہے ـــــ لوگوں کے جوتوں کے زخم اور مٹی کی مار کھاتے کھاتے جانے کہاں جا پہنچتا ہے ـــــ شاید وہاں جہاں وہ پہلی عورت ہو گی ـــــ جس نے اُسے اُٹھا کر اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے تھپکی دے کر پرس میں احتیاط سے رکھ لیا ہو گا یا پھر پھینک دیا ہو گا ـــــ لیکن وہ پہلی عورت ـــــ مجھے بھی یوں اُٹھا لیتی تو کیسا ہوتا ـــــ؟

خواہش

وہ بہت بہادر تھی، ضدی تھی اور میری تلاش میں بہت دُور تک نکل آئی تھی۔ جذباتی لڑکی تھی جبھی اُس نے میرے ایک قریبی دوست سے شادی کر لی کیونکہ اس میں اُسے میرا چہرہ نظر آتا تھا۔ وہ بہت ہی عجیب سی لڑکی تھی۔ عجیب اور مختلف نوعیت کی خواہش کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی بلکہ وہ یہ چاہتی تھی کہ اس کی کوکھ سے جنم لینے والے پہلے انسان کا باپ میں ہوں۔ مجھے ہی ہونا چاہیے ـــــ آخر مجھے ہی کیوں اور پھر میں ہی کیوں ـــــ کوئی اور کیوں نہیں ـــــ؟ یہ بات میں نے اب جانی ہے جب جاننے نہ جاننے سے کوئی بھی فرق نہیں پڑتا۔ جس طرح اُسے جائز یا ناجائز اولاد سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ کہتی تھی تخلیق تو تکمیل ذات ہے ـــــ پھر یہ عمل ناجائز عمل کیسے ہو سکتا ہے؟ میرے جس دوست سے اُس نے شادی کی تھی وہ جائز ناجائز کسی قسم کی اولاد دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا یہ بات اُس کے علم میں پہلے سے تھی۔ لیکن میں کسقدر جاہل انسان ہوں کہ کچھ بھی نہ جان سکا مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ وہ آخری مرتبہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ کیوں ملنا چاہتی تھی۔

اس کے فالج زدہ سرد جسم کو میرے ہاتھ کا لمس بھی بیدار نہ کر سکا۔ اُس کی آنکھوں میں طلب تھی، تلاش تھی تشنگی تھی ـــــ کیا بسترِ مرگ پہ بھی وہ مجھ سے پہلے والی بات کہنا چاہتی تھی۔ کیا وہ اپنے سوالوں کو میرے جواب کی آخری تسلی دینا چاہتی تھی۔ کیا آخری سانس تک خواہش زندہ رہتی ہے ـــــ؟

جب وہ میری زندگی کو اپنی موت کا داغ دے کر چلی گئی تو میں خاموش رہا۔ میری آنکھیں بھی خشک رہیں۔ میرے اعضاء بھی نارمل رہے۔ پھر جانے کن اجنبی ہاتھوں نے دروازے پہ دستک دی کوئی میرے ہاتھوں میں لفافہ تھما کر چلا گیا۔ میں نے کھولا۔ کئی صفحے میری جھولی میں گر پڑے۔ سفید سادہ کاغذ۔ جن پہ میرے آنسو گرتے رہے کچھ لکھتے رہے۔ ایک وصیت پہ دوسری وصیت یا اس کے خط کے

جواب میرے ہاتھ اپنے اردگرد کچھ تلاش کرتے رہے شائد معذرتی لفظ یا اس کی نہ لکھی ہوئی کہانی کے کچھ حصّے ـــ اس کی بھولی ہوئی اور یاد رہ جانے والی باتوں کے لبھے دھاگے جو وہ میرے پاس بھول گئی تھی یا پھر خود چھوڑ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی مجھے کس چیز کی کب ضرورت محسوس ہوگی۔ عیّار عورت جاتے جاتے بھی میرا کیا کچھ لے گئی یا بہت کچھ دے گئی۔ کوئی نہیں جانتا ـــ؟ کوئی نہیں جانتا!!

بے نام رشتہ

مجھے زندگی سے پیار کبھی نہیں رہا لیکن مجھے موت سے محبّت نہیں۔ میں نے زندگی کا ہر روپ دیکھا ہے۔ میں نے جس بھی چیز سے نفرت کی وہی میری جھولی میں آگری۔ جن راستوں سے کترا کے گزرنا چاہا انہی راہوں پہ بے انت سفر کی سزا مجھے دی گئی۔

میں نے خواب دیکھنے کی عادت پہلے دِن سے ہی ڈال لی تھی۔ میں نے جان لیا تھا کہ اس کے بغیر زندگی کا ایک پل بھی گزارنا ممکن نہ ہوگا۔ میں نے اور بہت سی باتوں کے بارے میں بہت جلد علم حاصل کر لیا تھا۔ اس علم اور شعور نے مجھے دوسروں سے مختلف ہونے کا احساس دلایا وہاں تنہائی کی لذّت سے بھی آشنا کروا دیا۔ رفتہ رفتہ میں کم گو ہوتی گئی پھر خاموشی سے میرا سمجھوتہ ہو گیا۔ میں نے بہت کم سمجھوتے کئے ہیں مگر یہ سمجھوتے مجبوری بن جاتے ہیں انہیں مجبوری ہی تصوّر کر لیا جاتا ہے۔ میں نے اسکول میں حساب کے اُن سوالوں کو کبھی حل نہیں کیا تھا جن میں چیزیں یا افراد فرض کر لیے جاتے ہیں پھر انہیں جمع تفریق اور تقسیم کے خانوں میں حسبِ خواہش یا حسبِ ضرورت منتقل کر دیا جاتا ہے۔ میں زندہ چیزوں پر یقین رکھتی ہوں۔ کسی بھی قسم کے انتقال کو فریب سمجھتی ہوں۔ میں اپنی چیزوں میں دوسروں کو شریک نہیں ٹھہرا سکتی۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ منفرد اور مختلف چیزوں کا انتخاب کیا ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے خریدی ہوئی چیزوں، ہم مزاج لوگوں کی حفاظت اور قدر کرنا جانتی ہوں۔ اس لیے کہ اُن میں میں ہوں ـــ میرا عکس ہے۔

جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو اس کے لفظوں کا بیج۔ چہرے کا کرب اور بھیگی بھیگی پلکوں کا ماتم میری برداشت سے باہر تھا۔ میں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ عورت کہیں اور سے نہیں میرے اندر سے بول رہی ہے۔ کبھی لگتا جیسے وہ میری ماں ہے، کبھی میری کوکھ میں پلنے والی ایک ناجائز اولاد جسے اپنائے بغیر میں رہ نہیں سکتی، رہنا نہیں چاہتی ـــ سزا طویل اور سخت کیوں نہ ہو اُس نے میری

جڑوں میں رہ کر میرے لہو کی ایک ایک بوند کا سودا کیا ہے۔ اُس جسم کا سودا جو میرا ہے۔ جس پہ میرا حق ہے۔ یہ اب میری مرضی پہ منحصر ہے کہ میں اُسے کسی ایک مرد کے حوالے کروں یا کئی مردوں کے، ہزار مردوں کی ضرورت اگر کوئی ایک ہی پوری کردے تو . . . . ؟ مگر وہ ایک مرد . . . . . ویسے مرد ہوتے کہاں ہیں ؟ جیسا وہ مرد تھا۔ میرے جسم کو کبھی اُس کا ہاتھ چھو کر نہیں گزرا تھا مگر میری روح پہ اُس کا لمس آج بھی زندہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میری کوکھ میں پلنے والے ہر بچے کا باپ وہی ہو۔ اگر وہ نہیں ہے تو کیوں نہیں ؟ رات کی تاریکی مجھ سے یہ خاموشی سوال کرتی۔ وہ ہر شام اس دروازے سے گزرتا۔ کبھی دروازے سے اندر بھی آجاتا اور گھر والوں سے گھنٹوں باتیں کرتا۔ وہ مجھ سے تو کوئی بھی بات نہیں کرتا تھا۔ بس چند لمحے کو اُس کی آنکھیں میرے چہرے پہ بھٹکتیں اور بس . . . . . !

میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی برسوں انجان رہی۔ برسوں سے اجنبی ہاتھوں کا لمس بلکہ وحشت اپنے بدن پہ محسوس کرتی رہی ــــ لگتا تھا کوئی دشمن کوئی غیر مرد میرے بدن کو جھنجھوڑتا ہے ــــ دن رات میرے جسم سے بدسلوکی کرتا ہے ــــ برسوں تک میں کسی تیسرے فریق کی طرح خود کو دور سے دیکھتی رہی۔ کسی مرد اور اس کے بچوں کی آوازیں سُنتی رہی ــــ ایک بے شکل عورت کا چہرہ دیکھتی رہی اور بے خبر رہی۔ سُنا ہے کسی عورت کو شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہے یہ جان کر کہ وہ جن بچوں کی ماں کہلاتی ہے، جس شوہر کی بیوی، اُن سب سے اُس کا کوئی رشتہ نہیں ــــ پھر جس سے رشتہ ہے وہ کہاں ہے ــــ آخر وہ کہاں ہے ؟

رتجگے

پہلے پہل جب وہ اپنی زندگی سے پیار کی بات کر رہی تھی تو نہیں جانتی تھی کہ کوئی دوسرا شخص بھی کہیں دُور بیٹھا وہی بات سوچ رہا ہوگا یا پھر کہہ رہا ہوگا۔ اُس دوسرے شخص سے اُس کی پہلی یا آخری ملاقات کا وقت کبھی طے نہ ہو سکا تھا۔ جب اُس نے شام اور رات کو ہم آغوش ہوتے دیکھا تھا، بچھڑتے دیکھا تھا تو بہت کچھ جان لیا تھا۔ تب وہ اپنی آنکھ دروازے پہ نیند کی چٹخنی لگانا بھول گئی تھی۔ ادھر کھلے دروازے سے کئی منظر خاموشی سے دیکھتی رہی تھی اور مسلسل جاگتی رہی تھی۔ وہ نیند کا رنگ تقریباً بھول چکی تھی جاگتے رہنے کی عادت پختہ ہو گئی تھی یہی ایک رنگ تو اس کے پاس باقی بچا رہ گیا تھا۔

تبھی ایک اجنبی مگر اپنے کی معرفت وہ نیند کے ایک خوبصورت، مختلف رنگ سے آشنا ہوئی۔ اجنبی نے اپنے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا وہ جانے کدھر سے آتا تھا، کدھر چلا جاتا تھا؟ وہ دن بھر کا بے چین مسافر جو اپنی تھکن مٹانے کی خاطر ہر رات بدن سرائے کا مہمان بنتا۔ صبح ہوتے ہی کہیں دُور ــــ بہت دُور نکل جاتا۔ وہ دن بھر رات کے انتظار میں دل دروازے پہ بیٹھی بنتی تھی، یہاں تک کہ شام کے پلو سے بندھی رات اس کے بستر پہ گر پڑتی۔ جتنی عمر تک وہ سمٹتی بکھرتی رہی۔ اتنی ہی عمر تک وہ تھکن کی دھول میں اٹا مسافر اس کے دروازے پہ دستک دیتا رہا۔

آج اُس نے مجھے بتایا کہ برسوں پہلے کا وہ مسافر اُس کے گھر کا راستہ بھول چکا ہے۔ کوئی اور بھی نہیں آیا۔ ایک مدت سے مکان خالی پڑا ہے۔ اب تو کئی نئے گھر تعمیر ہو چکے ہیں جب کہ اُس کا کرایہ بھی کم ہے اور وہ بھی اسے سستے داموں کسی کے ہاتھ بیچ بھی دینا چاہتی ہے۔ اُسے نئے گھروں کی تعمیر کا علم ہے۔ وہ یہ بھی سوچتی ہے کہ شائد کوری مٹی کی خوشبو کا جادو بہت ہوتا ہے۔ وہ کب آئے گا ــــ آئے گا بھی کہ نہیں ــــ کیا وہ آئے گا ــــ ؟

آج وہ سوالوں کی ایسی گٹھڑی بن گئی ہے جس میں وہم اور شک، شبہے اور اضطراب کی کئی رنگین کترنیں ایک ساتھ بندھ گئی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ گٹھڑی بندھی نہ رہ جائے یا غلط ہاتھوں میں جاکر اپنا آپ نہ بھول جائے ــــ کہیں کھو نہ جائے۔ ممکن ہے غلط ہاتھوں سے گزرتے گزرتے وہ کسی دن اُس دوسرے شخص کے ہاتھوں میں نہ پہنچ جائے۔ اگر وہ وہاں پہنچ کر گزر جائے گی تو ــــ تو پھر کیا ہو گا ــــ؟

سوالی

میں خود سے سوال کرتے کرتے تھک گیا ہوں پہلا سوال میں نے کب کیا تھا؟ وہ سوال کیا تھا مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ شاید اُس وقت جب میں نے پہلی مرتبہ ناکامی کا چہرہ دیکھا تھا اور خود سے سوال کیا تھا ــ ایسا کیوں ہوا تھا ؟

سوال کرتے کرتے مجھے اپنا چہرہ بھی ایک سوالیہ نشان کی صورت نظر آتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سوال کرنے کی عادت میرے بچوں نے بھی اپنالی ہے میں نے پھر ایک سوال کیا ــ کیا وہ میری اچھی عادتوں میں سے کسی بھی عادت کو نہیں اپنا سکتے تھے؟ مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں نے اپنی اولاد کو اپنی بُری عادتوں کے سوا کچھ نہ دیا۔ اطمینان بھی ہوا کہ میری اولاد کسی معاملے میں سہی میری پیروی تو کر رہی ہے تو کیا ورثے میں عادتیں بھی مل جاتی ہیں؟ پھر تو یہ موروثی بیماری ہوئی۔ میں خود بھی اس بیماری کا شکار تھا۔ میں نے اپنے بزرگوں سے مطالعے اور مطالبے کی عادت لی تھی۔ جبر اور صبر کی عادت بھی لی تھی جب کہ اپنی ذات سے جو جراثیم میں نے حاصل کئے تھے اُن میں خاموشی، دوسروں کو معاف کرنے، درگزر کرنے، سوال کرنے اور تشنہ رہ جانے کے جراثیم ایک عمر تک مجھ میں موجود رہے، دوسروں تک بھی پہنچے۔

اس کا سب سے زیادہ اثر میری بیٹی علینی نے قبول کیا۔ وہ خاموشی سے مطالعہ اور مطالبہ کرتی۔ عادتوں کی طرح مسکراہٹ بھی اُس نے مجھ سے لی۔ اُس کی ماں اپنی سمجھ کے مطابق سوچتی اور یقین کر لیتی کہ علینی کیا چاہتی ہے؟ وہ اپنی خواہشوں کے مطابق چلتی اور اسے بیٹی کی خواہش کا نام دے کر خوش ہوتی رہتی۔ جب کہ مجھے علم تھا کہ علینی دراصل کیا چاہتی ہے؟

میری بیوی اُن عورتوں میں سے تھی جن کی ساری زندگی مختلف کردار ادا کرتے گزرتی ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو معاشرتی اور سماجی زنجیروں میں بُری طرح جکڑ رکھا تھا جہاں فرد ثانوی ہے

اشیاء کی حیثیت کو ہی اصل اہمیت دی جاتی ہے۔ حقیقتاً ایسے لوگوں کے اندر کا انسان ایک مدت سے غائب ہوتا ہے۔ ایسے انسانوں کی روح کا کھو جانا کہیں ظاہر نہیں ہوتا۔ کسی کتاب میں درج نہیں ہوتا۔ کسی اخبار میں خبر نہیں ہوتی جب کہ علینی کی خبر ہر اخبار نے شائع کی تھی لوگ کہتے ہیں علینی نے خودکشی کی۔ میں خود سے سوال کرتا ہوں ــــ علینی نے خودکشی کیوں کی؟ کیا واقعی اُس نے خودکشی کی؟ کیا یہ اُس کی پہلی خودکشی تھی ــــ؟ کیا ہم سب نے اُسے بار بار قتل نہیں کیا ــــ کیا ہم نے ہر دفعہ اُسے قتل ہونے اور قتل ہوتے رہنے پہ مجبور نہیں کیا ــــ؟

کچھ لوگ مجھے ایک کمرے میں لے جاتے ہیں ــــ کمرہ بھی وہی پرانا ہے ــــ بستر بھی علینی کا ہی ہے۔ اور بستر پہ بھی علینی ہی سو رہی ہے ــــ علینی کی ماں اس کے سرہانے بیٹھی ہے ــــ پہلے تو وہ ہر وقت باتیں کرتی رہتی ہے ــــ اب وہ رو بھی رہی ہے ــــ علینی کے بہن بھائی بھی اسکی ماں کے گرد سہمے بیٹھے ہیں ــــ خاموشی کہیں روپوش ہو گئی ہے۔ شور بڑھتا جا رہا ہے ــــ آوازیں بلند ہوتی جا رہی ہیں ــــ کبھی کبھار کمرہ مٹی سے بھر جاتا تھا خصوصاً آندھی کے بعد ــــ لیکن یہ کیسی آندھی تھی ــــ کمرے میں لوگوں کی گرد تھی اور سارا کمرہ سوالوں سے بھر گیا تھا۔ بہت سے لوگ اردگرد جواب بھی تلاش کر رہے ہیں۔ کبھی کمرے میں ڈھونڈتے ہیں کبھی علینی کے چہرے پہ اور کبھی اس کی ہتھیلی پہ دیکھتے ہیں۔ پتہ نہیں اتنے سوالوں کے جواب کہاں ہیں۔ کوئی ایک جواب نہیں ہے یا پھر بہت سے جواب ہیں؟ میں بار بار بلکہ ہر بار خود سے سوال کرتا ہوں مگر سوال کی پیاس بڑھتی جا رہی ہے ــــ وقت کا حلق سوکھ گیا ہے اور لفظوں کے کانٹے چبھ رہے ہیں۔ میری نظریں پچھلے برسوں کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ گزرتے دن ہیں ــــ گزری صبحیں ہیں ــــ گزری شامیں۔ اور پھر وہ آخری شام ــــ لفظ میرے حلق میں پھنس گیا ہے۔

"معمولی سی بات تھی۔ اتنا زیادہ بُرا مان گئی لڑکی" علینی کی ماں کی آواز چیختی ہے چہرے اور آوازیں سوال کی کرنیں بن کر اُس کے اردگرد پھیل جاتی ہیں "کیا بات ہوئی تھی؟"

جواب میں وہ کہتی ہے۔

بھلا کوئی ماں اولاد کا بُرا چاہتی ہے ــــ؟

آوازوں کے ہجوم میں میں تنہا ہوں۔ آواز ــــ علینی کی آواز ــــ

"ابو ــــ میں بھی اپنا بُرا نہیں چاہتی ــــ!"

آخری جملہ ــــ میرے قدم رُک گئے ہیں ــــ تب سے رُکے ہوئے ہیں۔ میں پتھر ہو چکا ہوں۔ لوگ مجھے چلتے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں ــــ وہ میرے منتظر ہیں۔ عادت تو موروثی بیماری تھی۔ وہ انہیں کیسے لگ سکتی ہے ــــ؟ انہیں کیسے لگ گئی۔ شائد محلے یا شہر میں وبا پھیل گئی ہے۔ یہ وبا کیسے دُور ہو گی ــــ؟ تمام انسانوں کی رگوں میں خون کی جگہ سوال گردش کرنے لگے ہیں۔ سب کچھ سوالیہ نشان بن گیا ہے ــــ وہ کاغذ کا ٹکڑا بھی جس پہ علینی کچھ لکھنا چاہتی تھی!

دستخط

وہ دلہن بنی بیٹھی تھی مگر بغور دیکھنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ دلہن نہیں کوئی مُردہ روح ہے روح خاموش ہی رہتی ہے باتیں تو جسم کرتے ہیں ـــ اس کی ماں نے بھی اُسے جسم ہی سمجھا تھا تبھی اُس نے جسم سے گفتگو کے لیے ایک دوسرے جسم کو تلاش کیا تھا۔ اُس کی چُپ کا تالا زنگ آلود تھا۔ کسی چابی سے نہیں کُھلتا تھا ـــ پھر بارات آگئی، کمرہ خالی ہوگیا۔ اب صرف وہ اور میں دو انسان کمرے میں رہ گئے تھے۔ باقی سب چیزیں تھیں۔ میں نے اُس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھا۔ میری آنکھوں کا سوال اُس کی آنکھوں نے پڑھا۔

شائد یہی وہ لمحہ تھا جب وہ اس سوال کو حل کرنا چاہتی تھی تبھی اُس کی گہری چُپ ایک آہ سے ٹوٹی۔

اُس نے کہا ـــ میں شادی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر میری ماں ـــ جانتی ہو نکاح نامے پہ میرے نام کے دستخط میرے ہاتھوں نے نہیں کئے۔ ماں کے ہاتھوں نے کئے ہیں۔ اگر وہ میرے ہاتھ تھے تو روح نہیں تھی۔

حیرت میری آنکھوں سے آنسو بن کے چھلک پڑی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟ جیسے درد لفظوں میں ڈھل گئے۔ میری ماں نے میرے لیے نہیں اپنے لیے شوہر کا انتخاب کیا ہے ـــ جو شوہر اُسے نہ مل سکا وہ اُس نے بیٹی کی زندگی میں داخل کر لیا ـــ مگر تم نے کس طرح ـــ تم چُپ کیوں ہو ـــ؟ کیا نکاح کے وقت لوگ موجود نہیں تھے۔

کمرے میں صرف میں اور وہ عورت تھی۔ سچ کہوں تو سب مائیں اپنے لیے ہی شوہر تلاش کرتی ہیں۔ اور اس وقت میں اور وہ عورت ـــ مجھے یوں لگا جیسے اس کے لیے ماں کا لفظ وہ عورت میں تبدیل نہیں ہوا۔ وہ رشتہ مرا نہیں بلکہ اُس دلہن نے اُس رشتے کے جھوٹ کو اپنانے سے انکار

کیا ۔ تبھی وہ اپنے عمل سے اچانک وہ عورت جیسی اجنبی اور قابلِ نفرت بن گئی ۔

پھر کیسے ہوا یہ سب کچھ ؟

مجھے علم ہے مجھے کیا کرنا ہے ؟ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی ۔ میں اُسے جاتے ہوئے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کر سکی ۔ میرے پاؤں آج تک اسی کمرے میں کھڑے ہیں اور میں خود جانے کہاں ہوں ؟

بازگشت

ہم اس شہر میں نو وارد تھے ۔ میں اجنبیت کی آندھی میں اِدھر اُدھر ڈولتی رہی ۔ مجھے اس شہر میں وہ اپنائیت محسوس نہیں ہوئی تھی جو پچھلے شہر میں موجود تھی ۔ میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی اور شاھد کا اطمینان میری اُداسی کے درد کو بڑھا دیتا ۔ گھر میں مجھے بے پناہ وحشت ہوتی تھی ۔ تو پھر میں اور کہاں جاتی ؟

کبھی کبھار شاھد کے دفتر جا کر کچھ وقت گزار لیتی ۔ اُس روز بھی یوں لگا جیسے میرے اندر بہت کچھ بھر گیا ہے جو باہر نکلنے کا راستہ چاہتا ہے ۔ میں مانوس راستے پہ چلنے لگی اور اُس کے دفتر جا پہنچی ۔ شاھد کے کمرے میں ایک لڑکی بیٹھی تھی مجھے بہت اچھی لگی مگر دوسرے ہی لمحے مجھے شدت سے احساس ہوا جیسے شاھد کے سامنے بیٹھنے والی لڑکی خدا کی طرح ہر جگہ موجود ہو ۔ حتیٰ کہ شاھد کی رگوں میں بھی زندہ ہے ۔ اس کے گھر کی ہر شے میں زندہ ہے ۔ اس کی قمیض کے ہر بٹن میں ، اس کی ہر پسند و ناپسند میں بھی وہی شامل ہے ۔ اس کے ہر معمول میں اسی کا عمل دخل ہے ۔ اس کے ہر رویے ہر برتاؤ میں وہی جھلکتی ہے ۔ تب مجھے اپنا وجود اتنا بے معنی اسقدر غیر اہم محسوس ہوا کہ میرے پاؤں زبردستی مجھے بھگا کر دوسرے شہر میں لے آئے ۔ میں اپنے کمرے کی دیوار سے لپٹی سسک رہی تھی ۔ آنسوؤں نے ہر شے دھو دی تھی بہت کچھ واضح ہو گیا تھا ۔ میرا بدن اُجلا ہو گیا تھا بس اگر کچھ میلا تھا تو میرے اور شاھد کے بیچ کا رشتہ ہمارے جسموں کے نیچے بچھی چادر !

اُس وقت شاھد کے ہاتھ نوٹ گن رہے تھے ۔ میں اُس زندگی کی آخری سانس گن رہی تھی جب اُس نے کہا تھا

"پسندیدہ عورت اور تنخواہ میں کوئی فرق نہیں۔ جب بھی ملتا ہے لگتا ہے پہلی بار ملتی ہے
اور شائد آخری مرتبہ بھی .....!
آخری مرتبہ بھی ..... آخری مرتبہ بھی!

عادی

وہ اُس کے لیے ہر روز ایک نیا گڑھا کھودتے اور اس میں پھینک دیتے۔ وہ روز روز گرتے رہنے کا عادی ضرور ہو چکا تھا مگر اس تجربے نے اُسے بہت تھکا دیا تھا۔ اب اُس کی تھکن اس گڑھے میں گر کر دوبارہ اٹھنے کا سوچتی اور کبھی بغاوت سر اُٹھا کے احتجاج کرتی، آئندہ گڑھوں میں گرنے سے انکار کر دو۔ اُس نے کئی روز گڑھوں میں گرے ہوئے اپنے وجود کے مختلف حصّوں کو سمجھانے کی کوشش کی مگر ہر بات ناسمجھی پہ آ کے رُک جاتی۔ ایک الجھن پھر دوسری الجھن اور یوں الجھنوں کا سلسلہ بنتا چلا گیا۔ پھر یہی تمام سلسلے پہاڑوں کے سلسلوں سے بھی آگے بڑھ گئے۔

اب وہ مٹی دیکھ کر خود بھی مٹی ہونے لگتا۔ اُسے ہر برتن، زمین کا ہر حصّہ اپنے وجود کی طرح قابلِ نفرت محسوس ہوا اور پھر جانے وہ مٹی کی دوسری ڈھیری کہاں سے اُس کے گڑھے میں آ گری یا وہ خود ہی غلطی سے اُس کے گڑھے میں گر گیا تھا۔ اس میں اس کی رضا شامل نہ تھی وہ تو دوسروں کے لیے خود گڑھے خالی چھوڑ دیا کرتا تھا جس طرح کوئی بھی شخص اپنا کمرہ کسی دوسرے کے لیے چھوڑ دیتا ہے یا مکان پھر بھلا وہ کسی اور کے مکان میں یا کسی کمرے میں کیسے جا سکتا تھا؟ مگر اب تو وہ چلا گیا تھا اور وہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔ شائد وہ بھول کر ایک مُردہ کنویں میں گر گیا تھا۔ مُردہ کنویں میں وہ زندہ تھا۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ اُس ڈھیر سے دوستی کی۔ اس سے چھپ کر ایک خفیہ راستہ بنا لیا۔ جہاں سے وہ باہر نکل سکتا تھا۔

جب وہ باہر نکل گیا تو اُس کا جی چاہا وہ دوبارہ غلطی سے نہیں بلکہ اپنی خواہش سے اُسی گڑھے میں گر جائے۔ اُس مُردہ کنویں میں موت کے ساتھ ساتھ زندگی بھی تھی — آہ! وہ زندگی جس زندگی کی اُسے شدید ضرورت تھی — صرف اس لمحے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ایک اہم ضرورت!

کمرہ نمبر ۴۵

آج پھر میں خواب کی دسترس سے باہر نکل آئی۔ اس کی خالی ہتھیلی پھیلی رہی اور وقت سے میری ملاقات ہو گئی۔ "ملاقات" جس طرح اُس شخص سے میری پہلی ملاقات سفر کے دوران ہوئی تھی۔

پھر ہم دونوں . . . ؟

ابھی تک اس کے سگریٹ اور رویّے کی تلخی مجھ میں زندہ ہے۔ میں اُداسی کے گھونٹ بھرتی ہوں اور خاموشی سے کلام کرتی ہوں۔ "خاموشی" ہاں میں خاموشی سے خوف محسوس کرنا چاہتی تھی۔ میں نے تو رات کے اس لمحے بھی ایک ہی سوال کیا تھا۔

"کیا صرف میری موجودگی کافی نہیں ہے؟"

اُس نے میرے سوال کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ سوال رونا رہا تھا وہ ابھی بھی سسک رہا ہے۔ اُس نے تو مجھے صرف سو جانے کو ہی کہا تھا اور بس ——

میں تو جاگتی ہی رہی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتی رہی تھی۔ اور سوچتی رہی۔

کیا کوئی بھی مرد عورت کو کبھی بھی نہیں جان سکتا۔ کیا اُسے علم نہیں ہوتا کہ عورت کیا چاہتی ہے؟ مجھے اُس کی ضرورت ہے —— اُسے میری ہی جانب اپنا چہرہ رکھنا چاہیئے —— جب میں اُسے بظاہر روتی ہوئی نظر آئی تو اُس نے سوال کیا تھا —— میرے رونے کی وجہ بھی دریافت کی تھی۔ "سردی"؟

حیرت سے اُس نے میری بات کا جواب دیا تھا ——

کچھ دیر مجھے بانہوں کی گرمی دے کر رات بھر سردی میں ٹھٹھرنے کے لیے بستر کے

ایک کونے میں "میں" تنہا رہ گئی تھی ـــ تنہائی کی اذیت میں نے اپنی روح اور اپنی جان پر جھیلی تھی۔

صبح اُس نے مجھ سے رات کی کوئی بات نہیں کی تھی ـــ آخر وہ کیوں کوئی بات کرتا؟ میں تو اس ہوٹل کے کمرہ نمبر ۴۵ میں اُس کی بیوی بن کر اُس کی خواہش پہ ایک رات کے لیے مجبوراً ٹھہری تھی اور بس ـــ!

دُھنو

اُسے گھر سے نکلے ہوئے کئی برس ہو گئے تھے شاید اتنے کہ اُس کے گھر والے بھی اُسے فراموش کر چکے تھے اور اُس کی گمشدہ زندگی کی تلاش میں وقت برباد نہیں کرتے تھے۔ پتہ نہیں وہ گمشدہ بھی تھی یا نہیں۔

زندہ تھی کہ مر چکی تھی۔ کبھی کبھی اُس کی موت یقینی محسوس ہوتی تھی اور کبھی یوں جیسے وہ زندہ ہو۔ میں اسے بہت قریب سے جانتی تھی مگر یہ بات میں اُسے کہہ نہیں سکتی تھی وہ کہی گئی باتوں کو فوراً جھٹلا دیتی تھی ـــ کوئی بھی کسی کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتا اور جو جانتا ہے وہ دُرست نہیں ہوتا۔ تم یا کوئی اور یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے بلکہ کوئی بھی دعویٰ کیسے کر سکتا ہے ـــ؟

وہ جھوٹ اور منافقت سے شدید نفرت کرتی تھی وہ بہت حساس اور زود رنج تھی۔ چیزوں کو وضاحت سے بیان کرنے اور جذبوں کو ظاہر کرنے پہ یقین نہیں رکھتی تھی۔ میں بھی اس کی ہم مزاج تھی اور ہر وقت کا کرب، عذاب میرے ماتھے پہ بھی لکھا تھا ـــ ماتھے پہ نظر نہ آنے والی تحریریں مٹائی نہیں جا سکتیں۔

وہ شدید ذہنی الجھنوں کا شکار رہتی تھی۔ ہمیشہ مسائل اس کے آنچل میں بندھے رہتے۔ اُس کے پاؤں کی دُھول میں لگے رہتے۔ ایسے مسائل جنہیں کوئی اور حل نہیں کر سکتا تھا۔ بس وہ تنہا اپنے ساتھ جنگ کرتی رہتی۔ فتح و شکست کی تیز تلوار پہ چلتی رہتی۔

اس کے بند کمرے میں کسی اجنبی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ پہلے ہی قدم پر اجنبی کے پاؤں مزید سفر کرنے سے انکار کر دیتے اور اِسے پلٹنا پڑتا۔ پتہ نہیں کیا بات تھی میرے قدموں کا خیر مقدم ہمیشہ اس کے کمرے نے کیا تھا یوں جیسے اپنوں کا کیا جاتا ہے۔ اُس کا خاموش کمرہ، کہانیوں کی کتاب کی طرح تھا، بہت کچھ کہتی سُنتی کہانیاں۔ وہ اُس کمرے میں چھپ کر زندگی گزارنے کے

جنن کر رہی تھی وہ جانتی تھی کہ اگر وہ کمرے سے باہر نکلی تو گھر — گلی — محلے اور شہر کو ہی نہیں وہ ساری دُنیا کو نگل لے گی۔ اُسے اپنے لفظوں سے ڈر لگتا تھا۔ وہ اپنی برہنہ سوچوں سے خوفزدہ تھی۔ اُس کی وحشت کسی نئے راستے کو تلاش کر رہی تھی۔ اس کا جنون اُسے پکار رہا تھا وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ وہ چاہتی تو پانچ منٹ میں اس گھر کو چھوڑ دیتی جہاں وہ پانچ سو سال تک رہنے پہ مجبور کر دی گئی تھی۔ اس کا ایک لفظ انہیں سزا سُنا دیتا مگر ان کے لیے ایک ہی پل کا عذاب کیوں —؟ انہیں ہر لمحہ نئی موت کا سامنا کرنا چاہیئے۔ جس طرح وہ ہزاروں برس تک ہر نئے پل نئی موت کا ذائقہ چکھنے پہ مجبور کی گئی تھی۔

پھر جانے وہ کہاں کھو گئی —؟

پتہ نہیں اُس کا آخری فیصلہ کیا تھا —؟ وہ کچھ دیر کے لیے کھو گئی تھی یا ہمیشہ کے لیے — اف! میرے خدایا! میرے اِرد گرد تو دُھند ہی دُھند ہے۔ کیا میری ذات بھی تلاش گمشدہ کا اشتہار بنتی جا رہی ہے۔

میری دوست اُداسی بھی انتظار کی آگ میں جل کر راکھ ہوئی جا رہی ہے۔ میں دُھند میں پیدا ہوئی ہوں۔ ہم سب دُھند میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے خود شناسی کے فن کو نہیں جانتے۔ کیا ہماری تمام نسلیں دُھند کی پیداوار ہیں؟

دُھند کے انسان — دُھند کے مکانوں میں زندگی اور موت سے کھیلتے ہیں۔ موت ان کے مکانوں پر سُرخ نشان لگا کر آگے بڑھ گئی ہے — زیست کا دائرہ ان کے گرد تنگ ہوتا چلا جا رہا ہے — اب صرف ایک نقطہ بن کے رہ گیا ہے — آہ — آخری نقطہ —!

پی۔ کے۔ ۳۰۲

وہ محبت ڈھونڈنے نکلا تھا — مگر تلاش ختم نہ ہوئی تھی — وہ برسوں سفر میں رہا۔ اب بھی وہ سفر میں تھا — ایک نظر آنے والے سفر میں — اُس کی ہم سفر خاتون، اجنبی ضرور تھی لیکن خوبصورت اور حسین بھی تھی — وہ گفت گو بھی عمدہ کرتی تھی اور خوش لباس بھی تھی — گویا وہ سونے پہ سہاگہ تھی — معمولی دُعا سلام سے بات آگے بڑھی اور پھر دوستی — یہ پی کے ۳۰۲ کی پرواز تھی جس پہ وہ اتفاقاً مل گئے تھے۔

اسلام آباد ایئرپورٹ پہ اترنے کے بعد دونوں نے اگلی ملاقات کا وقت اور جگہ کا تعین کر لیا تھا — یوں وہ بار بار ملتے رہے — بچھڑتے رہے۔

برسوں بعد آج پھر خواہش کی آگ سُلگی۔ راکھ میں دبی چنگاریاں کبھی کبھی بھڑک اٹھتی ہیں — اُس کی طلب دیوانی تھی — عجیب بات تھی وہ عورت میں چھپی محبت اُس کی خاموشی میں تلاش کرتا تھا۔ خاموشی کے ساتھ ساتھ وہ عورت کو اُس کے ہاتھوں سے پہچاننے کی کوشش کرتا۔ وہ جب بھی کسی نئی عورت سے متعارف ہوتا کبھی نہ کبھی اُس سے کھانے کی فرمائش ضرور کرتا۔ عجیب مرد تھا عورت کو لذت کے ترازو سے تولتا تھا۔ کہتا تھا — اگر کوئی عورت مجھ سے محبت کرتی ہوگی تو پہلی ہی مرتبہ اس کے ہاتھوں کا پیار۔ مجھے اپنے گرد کھینچ لائے گا۔ اگر وہ چاہتی ہوگی تو لذیز کھانا بنا کر میری تواضع کرے گی — بہت توجہ سے کھانا پکائے گی۔ اگر وہ مجھ سے محبت نہ کرتی ہوئی تو کسی اور کے خیالوں میں کھوئی ہوگی۔ سالن میں نمک زیادہ ہوگا اور روٹی جلی ہوئی یا ادھ کچی ادھ پکی رہ جائے گی۔ اگر سالن میں نمک کم ہوگا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ میرا مزاج سمجھنے کی کوشش میں ہے — گرم گرم روٹی پہ خوبصورت بھورے پھول گڑھے ہوں گے تو اس کی چاہت سچی ہوگی اُسے علم ہی نہ ہوا تھا کہ وہ ایک محبت سے محروم ہو گیا ہے۔

اگر وہ جانتی کہ یہ مرد پہلے امتحان میں کامیابی کی شرط رکھتا ہے تو یقیناً وہ محتاط ہوتی ـــ مگر اُس جذباتی اور جلد باز شخص نے کب جانا تھا کہ وہ اس کی خاطر دوبارہ کھانا ٹھیک سے بنا سکتی ہے ـــ پہلی مرتبہ تو گھبراہٹ میں مرچ زیادہ ڈل سکتی ہے اور روٹی بھی جل سکتی ہے ـــ مگر وہ ٹھہرا انتہا پسند ـــ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔ کون جانے کب وہ کیا کر بیٹھے ـــ کیا کہہ بیٹھے ـــ اس دن سے اگلا ہی دن تو تھا جب وہ اس شہر سے اسی پرواز نمبر پی۔ کے۔ ۳۰۲ میں سفر کر رہا تھا اور اُسے ایک دوسری خوبصورت ہم سفر میں اپنا آئیڈیل دکھائی دے رہا تھا ـــ جانے پہلی ہم سفر کے ساتھ سچ گزرا تھا یا اس نئی ہم سفر کے ساتھ سچ بیت رہا تھا ـــ۔ واقعہ ایک ہی نوعیت کا تھا اور حیرت ہے کہ پرواز کا نمبر بھی وہی تھا ـــ!

مکالمہ

احمد علی تم کون ہو؟

میں ایک تنہا شخص ہوں۔

کیا باقی لوگ تنہا نہیں ہوتے؟

ہوتے ہیں مگر تنہائی کا احساس کسی کسی کو ہوتا ہے۔

تمہاری تنہائی کیسی ہے؟

زہر جیسی اور کیسی؟ تنہائی کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں۔ تنہائی تو صرف اور صرف تنہائی ہوتی ہے اور بس ـــ۔

اچھا ـــ تم کیا کرتے ہو؟

بہت کچھ کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ شائد اسی طرح خود کو بہلا سکوں۔

پھر بہل جاتے ہو ـــ۔

نہیں خود کو دھوکہ دینا پڑتا ہے ـــ۔

کیا دھوکہ دینا ضروری ہے ـــ؟

ہاں ـــ جینے کا سلیقہ آجاتا ہے۔۔ پھر دوسروں سے دھوکہ کرنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

تم کام کیا کرتے ہو ـــ؟

میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی میں آرٹ ڈائریکٹر ہوں۔

کیسا لگتا ہے ـــ۔

سچ کہوں تو بُرا لگتا ہے ـــ وہاں سب کچھ بکتا ہے ـــ میں بھی ـــ لیکن جینے کے لیے یہ بیزاری برداشت کرنا پڑتی ہے۔

تم رہتے کہاں ہو ــــ؟

میں ایک سرائے میں رہتا ہوں مگر لوگ اُسے میرا گھر کہتے ہیں ۔

گھر اور سرائے میں تو فرق ہوتا ہے ۔

ہوتا ہوگا ــــ میں کیا جانوں ــــ؟

تمہارا المیہ کیا ہے ــــ؟

میرا المیہ ــــ شائد یہ کہ بہت سے لوگ مجھے روند کر آگے نکل گئے اور کچھ پیچھے رہ گئے میرے ساتھ کوئی بھی نہیں چلا ــــ میں بھی نہیں ــــ۔

کیا یہ سچ نہیں کہ تمہارے ساتھ تمہاری ماں چلتی رہی ہے ــــ؟

نہیں ــــ ہر قدم پہ سمجھوتہ کرنے والی عورت میرے ساتھ کیسے چل سکتی ہے ــــ میں غیر ضروری سمجھوتوں سے نفرت کرتا ہوں ــــ۔

یہ مانتے اور جانتے ہوئے بھی کہ سمجھوتے وقت کی ضرورت ہوتے ہیں ــــ؟

ہاں ــــ۔

تمہارا کوئی دوست ہے ؟

ہاں میری ایک دوست ہے ــــ وہ کھاری ہے ــــ عمر میں مجھ سے بڑی اور ذہنی اعتبار سے میری ہم عمر ــــ بہت قریب اور بہت دُور ــــ بس کن وہ میرے جیسی ہے ــــ۔

وہ تمہارے جیسی کیسے ہو سکتی ہے ؟

وہ میری طرح سوچتی ہے ــــ اُس کا اور میرا موضوع ایک ہے ــــ موت ــــ۔

موت تمہارا موضوع کب سے ہے ؟

شائد بچپن سے ــــ میں نے پہلی مرتبہ موت اپنے والد کی دیکھی تھی ــــ تب میرے نزدیک موت محض کافور کی خوشبو میں لپٹی کوئی ان دیکھی شے تھی ــــ پھر میں نے بنا کافور

کے اپنی آنکھوں سے موت دیکھی ــــ زندہ رہتے ہوئے ہر پل کی موت ــــ خواہش موت کی جانب پہلا قدم ہے ۔ تنہائی اور اُداسی موت کی بہترین مثال ہیں میری پہلی موت پانچ برس کی عمر میں ہوئی تھی ــــ آخری موت جانے کب ہوگی اور کیسی ہو گی ؟

عموماً لوگ موت سے خوفزدہ ہوتے ہیں ــــ کیا تم نہیں ہوتے ؟

نہیں ــــ لوگ موت سے نہیں جدائی سے ڈرتے ہیں ۔ میں کسی سے جدا ہونے سے خوفزدہ نہیں ہوتا ــــ میں نے ہزاروں جُدائیاں دیکھی اور جھیلی ہیں ۔ یوں تو اپنے سے کٹ کر بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے ــــ مگر ــــ لوگ ایسا کرنے سے روکتے ہیں ــــ مسرت کو جانے والی کوئی شارع عام نہیں ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو ــــ وہ مجھے مل جاتی ــــ۔

وہ کون ــــ تمہاری دوست ــــ؟

نہیں ــــ محبوبہ ــــ وہ پہلی عورت تھی اور وہ اندر سے بہت روائتی اور کمزور تھی ــــ بظاہر بہادر بننے اور مختلف بنے رہنے کی کوشش کرتی تھی ۔ وہ معاشرے کے مروجہ قوانین کو نبھاتے ہوئے مجھ سے دُور چلی گئی ۔

اور میری دوست ــــ وہ اور ہم دُکھ کے شریک ہیں ــــ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد بھی ایک حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا مگر وہ آج بھی اس میں زندہ ہے ۔

آج وہ ایک شادی شدہ عورت ہے ۔ اس کا شوہر پردیس میں ملازمت کرتا ہے اور وہ یہاں بیٹھی تنہائی کی تصویر بنی رہتی ہے ــــ وہ مجھ سے بھی محبت کرتی ہے ۔

کیا محبت ایک سے زائد مرتبہ ممکن ہے ؟

ہاں ــــ کیوں نہیں ــــ۔

تم بات مکمل کرو۔۔۔ میں نے یونہی راستے میں روک دیا

ہونہہ۔۔۔ وہ مجھے چاہتی ہے اور میں اسے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ تم میری ضرورت نہیں ہو۔ میرے قریب نہ آؤ۔ وہ بہت حساس ہے۔۔۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اُسے اس اذیت سے بچالوں۔۔۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔۔۔ میں نے اُسے کہہ دیا۔۔۔

کیا کہا۔۔۔؟

یہی کہ میری وجہ سے اپنی گھریلو زندگی تباہ مت کرو

پھر۔۔۔؟ اُس کا۔۔۔ بریک ڈاؤن ہو گیا۔۔۔ میں نے اسے تب بھی دلاسہ دینا چاہا تو اُس نے میرے لفظ لوٹا دیئے۔۔۔ اُسے دلاسہ نہیں۔ میری ہمدردی اور محبت چاہیئے تھی۔

اُسے میرے وجود کی ضرورت تھی۔۔۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ محبت وہ سکہ نہیں جسے بھیک میں دیا جا سکے۔۔۔ اس کے شوہر کی وطن واپسی نے اُس کو واپس اُس کے گھر میں پہنچا دیا۔ ایک روز ملی تو کہنے لگی۔

"احمد علی کہانی لکھنا اور کہانی بننا بہت مختلف تجربے ہیں۔ میں کہانی لکھ سکتی ہوں لیکن کہانی بن نہیں سکتی۔ میں بھی ہر عورت اور مرد کی طرح سمجھوتہ کر رہی ہوں۔

کیا دوست عورت تم سے جدا ہو گئی؟

ہاں وہ میری ہم مزاج تھی اسی لیے جُدا ہو گئی۔

اور وہ جو تمہاری محبوبہ تھی۔۔۔؟

وہ جُدا ہو کر بھی جُدا نہ ہو سکی۔۔۔ وہ تو مجھ میں زندہ ہے۔

پھر تم اسقدر اُداس کیوں رہتے ہو۔۔۔؟

اُداس۔۔۔ اس لیے کہ میں تنہا ہوں۔ رنگوں سے میں کاغذ اور کینوس کو نئی زندگی دے سکتا ہوں لیکن اپنی بے رنگ زندگی میں نیا پن نہیں لا سکتا۔ اس رنگ کو نہیں مٹا سکتا۔۔۔

اُداسی اور تنہائی کے رنگ بہت پکّے ہیں۔ زندگی اور خواب دونوں کا سفر تنہا طے کر رہا ہوں۔۔۔

کبھی خواب میں کوئی ساتھ نہیں دیکھا؟

جاگتی آنکھوں سے اس کے ساتھ کو دیکھا تھا مگر وہ ساتھ نہیں چل سکی۔

کبھی نیند میں خوفزدہ ہوئے۔۔۔؟

ہاں۔۔۔ نیند آجائے تو بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ چونک کر جاگتا ہوں۔۔۔ آگ میں گھرا رہتا ہوں۔ میرے اردگرد الاؤ ہے۔ آگ ہے اور اسی آگ میں مجھے رہنا ہے۔۔۔ یہ واحد سمجھوتہ ہے جو میں کر چکا ہوں ورنہ سمجھوتہ میری موت ہے۔۔۔

اور تم کہتے ہو تم موت سے نہیں ڈرتے۔

ہاں۔۔۔ میں زندگی سے ڈرتا ہوں۔ زندگی کے زہر سے ڈرتا ہوں۔

تم کیسے ڈرپوک ہو کر اپنے اندر کی باتیں مجھ سے کہہ رہے ہو۔۔۔؟

تم سے نہیں ڈرتا۔۔۔

کیسے ممکن ہے؟

تم میرا عکس ہو ناں۔۔۔ شائد اسی لیے تم سے سب کچھ کہہ رہا ہوں۔

کیا صرف اسی لیے؟

نہیں ایک اور وجہ بھی ہے۔۔۔ میں مرنے سے پہلے کسی سے مکالمہ کرنا چاہتا تھا۔ تم نہ ملتے کوئی اور مل جاتا۔۔۔ تب بھی یہ سب کچھ مجھے کہنا تھا۔۔۔

بہت سے خالی کینوس بھی میری تصویروں سے بھرے رہتے ہیں۔ سوچ رنگوں سے تصویر بنا ہی کرتی ہے۔۔۔ آج حرف اور آواز سے بھی تصویر بنا دیکھوں۔۔۔

کیسا تجربہ رہا ــــ؟

کامیاب ــــ یہ میری آخری تصویر ہے ــــ!

آخری تصویر ــــ؟

ہاں آخری تصویر ــــ اس کے بعد خاموشی ــــ!

ادھورا خط

مجھے تم چاہیئے ہو ــــ تمہارا نام نہیں ۔ اگر نام کی خواہش ہوتی تو خود بے نام نہ بنتی ۔ مجھے تمہارا سچ چاہیئے ۔ جس سچ میں جھوٹ شامل ہو جائے وہ جھوٹ کہلانے لگتا ہے ۔

شروع سے جھوٹی چیزوں کی عادت پڑ گئی ۔ جو کچھ بھی بچ رہتا وہی میرے حصے میں آ رہتا ۔ یہی تھوڑا تھوڑا میری زندگی کا بہت سا بن گیا ۔ میں اپنے حصے کا کسے دیتی ۔ ؟ تم مجھ پوری کو لینا چاہتے ہو ۔ میں نے بھی شائد کسی اور کے لیے کچھ نہیں بچایا ۔ تم پورے میرے حصے میں تو آئے ہی نہیں ۔ آ ہی نہیں سکتے تھے کہ تمہیں میری ادھوری زندگی میں آنا تھا ۔ تمہارے آنے کا انتظار میں نے برسوں کیا ۔ تمہاری خواہش میں نے اُس وقت کی تھی جب میری گڑیا کا بیاہ ہو گیا تھا اور میں تنہا رہ گئی تھی یا پھر اُس وقت جب میری باری آنے پر کھیل ختم ہو جاتا ۔ کوکلا چھپاکی کھیلتے ہوئے بھی میری شامت آتی تھی ۔ ہمیشہ ہر کھیل میں میں ہار جایا کرتی تھی ۔ کلاس میں بھی اکثر فیل ہو جایا کرتی تھی ۔ جانے کن ظالم لمحوں نے میری گود میں دوشیزگی ڈال دی ــــ مگر مجھ ادھوری کو مکمل کون کرتا ــــ؟

میں ادھوری تصویر ہوں ــــ ایک مکمل نہ ہونے والی کہانی ہوں ۔ مجھے خود سے کہیں زیادہ تمہاری ضرورت ہے ۔ مجھے تمہارے دُکھ ، تمہاری سوچیں تمہارے عذاب چاہیئے ہیں ۔ جی چاہتا ہے کسی کاغذ پہ لفظوں کے خوابوں کے رنگ بکھرے ہوں اور وہ کاغذ تمہاری طرف سے آئے ۔ تم اُس پہ نام بھی نہ لکھو تو میں پہچان لوں گی ۔ مجھے تمہارے دُکھوں ، تنہائیوں اور اُداسیوں سے بھری گٹھڑی سے بہت پیار ہے ۔ میں تم سے کچھ بھی چھیننا نہیں چاہتی سوائے اُن لمحوں کے جو تم پر میرا قرض ہیں ــــ میرا حق مجھے لوٹا دو ۔

میری طرح تمہاری انا بھی راستہ روک کے کھڑی ہو جاتی ہے اسی لیے تم خط نہیں لکھتے ، ٹیلیفون نہیں کرتے ، دروازے پہ دستک نہیں دیتے ۔

ہم تم ایک دوسرے کو ابھی دیکھ بھی نہیں پاتے کہ وقت کی آندھی ملاپ کے لمحے لے اُڑتی ہے۔ بس آنکھوں میں ایک پیاس باقی رہ جاتی ہے۔ تمہاری بھیجی ہوئی چیزیں مجھ تک پہنچتی ہیں کسے ٹوٹے ہوئے آنسو کی طرح — چیزوں کے ساتھ اگر تم کوئی لفظ یا کورا کاغذ بھی بھیج دیا کرو تو کتنا اچھا لگے۔ تم سے ملے ہوئے تو صدیاں نہیں ہوئیں مگر ہاں تم سے بچھڑے ہوئے ضرور ضرور زمانے ہو گئے۔

میں شہروں اور بستیوں سے بہت دُور بھاگتی رہی ہوں۔ ان شہروں سے مجھے خوف آتا ہے مگر ان لوگوں سے ملنا بھی تو ایک طرح کی مجبوری ہے — جیسے تمہیں دن میں ہزاروں لوگوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرا کے ملنا پڑھتا ہے۔

تم بھی تو میری مجبوری ہو۔ میں اس مجبوری کو اپنے آپ میں بھر لینا چاہتی ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ جیسے میں اُداس ہونے کی عادت ترک کرنا چاہتی ہوں۔ اب میں نے خوش ہونے کی مشق شروع کر دی ہے — تم اس طرح میرے اردگرد پڑاؤ ڈالے بیٹھے ہو۔ تمہیں میں درخت کی چھاؤں سا سکھ دیتی ہوں۔ مگر وہ دھوپ جس میں برسوں جھلستی رہی ہوں — دھوپ میں یہ سایہ کیسا میرے دوست؟ یہ سایہ یہ چھاؤں تو چاند کے اختیار میں ہوتی ہے۔ تم چاند ہو تبھی چھاؤں کی ٹھنڈک کی بات کرتے ہو۔ دھوپ تو میں ہوں — آؤ دونوں مل کر زندگی کی شام منائیں۔ یہ زندگی کی شام ہی تو ہے۔ گھڑی دو گھڑی ٹھہرے گی پھر رات کی مہمان ہو جائے گی۔ مہمان کیوں بننا پڑتا ہے؟ تم میرے میزبان بھی ہو اور مہمان بھی — آؤ تمہاری آرتی اتاروں۔ تمہارے پاؤں کی دھول مانگ میں سجاؤں — یہ سوچ کر ہی خوشیاں میرے اندر باہر دھمال ڈالنے لگتی ہیں۔

تمہارے آنے کے خیال سے ہی میں بہت اونچی ہو جاتی ہوں۔ سارے زمانے سے بلند اور جیسے خوشبختی کے اُجالے میں نہا جاتی ہوں۔ یہ کچھ دن بھی بہت ہیں — کسی حد تک تو گزرے دنوں کا کفارہ ادا کریں گے — تم کئی دنوں سے خاموش ہو کیا یہ وقت بھی یونہی خاموشی میں گزار دو گے؟ اب تو میں تمہاری عادتیں اپنا چکی ہوں۔ تمہاری عادتیں، تمہارے دکھ تو میری امانت ہیں۔

آؤ مجھے میری امانت سونپ کر خود سُکھی ہو جاؤ — اپنی زندگی کے سارے بوجھ میرے آنگن میں اتار دو۔ مجھے یہ بوجھ اُٹھانے دو راہی — تم میری زندگی کی اس ویران راہ پہ کہاں سے آ نکلے؟ دن رات تمہاری سوچیں میرے گرد جالا بُنتی ہیں۔ اب تو مجھے بھی تمہیں بُننے کا سلیقہ آ گیا ہے۔ تکمیل کی جانب پہلا قدم مبارک ہو۔

تمہارے بغیر میں ادھوری تھی — ادھوری ہوں — اس ادھورے خط کی طرح جو کبھی تم تک نہ پہنچ پائے گا کہ راستے کی دشواریاں اور فصیلیں بہت زیادہ ہیں اور تم نے مجھے فصیل پھلانگنے کی تربیت نہیں دی —!

دائرہ

میں بہت اکیلی ہوں مجھ سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا۔ سب لوگ آپا کو چاہتے ہیں۔ میری ضرورت کسی کو نہیں ہے۔ شائد میں بہت حساس ہوں اسی لیے بہت چھوٹی چھوٹی باتیں بھی میرے لیے بڑی ہو جاتی ہیں۔ اہم ہو جاتی ہیں۔ ہر وقت ماں مجھی کو ڈانٹتی ہے۔ سب کہتے ہیں میں بہت زیادہ REACT کرتی ہوں۔ میری سوچ بھی مثبت نہیں بلکہ منفی ہے ــــ یہ لوگ کیوں نہیں جانتے کہ میں ایسا کیوں سوچتی ہوں۔ کوئی بھی منفی رویہ کیوں اپناتا ہے۔ جب ہمیشہ اچھائی برائی میں تبدیل ہو جائے ــــ ہر سیدھا کام الٹ ہو جائے تو کیا منفی سوچ نہیں ہوگی۔ یہ سب لوگ مل کر ہی تو منفی سوچ کی عادت ڈال دیتے ہیں۔

آپا سے سب کو محبت ہے اس لیے کہ وہ نوکری کرتی ہے۔ وہ بہت خوبصورت ہے۔ ہمیشہ مسکراتی رہتی ہے۔ اور پھر پہلی اولاد ہے ــــ بابا تو بہت حساس ہونے کے باوجود بڑی سے بڑی بات پر REACT نہیں کرتے۔ انہیں کوئی حادثہ کوئی بات نئی نہیں لگتی شائد وہ بڑے بڑے حادثات سے گزر چکے ہیں۔ ماں ہمیشہ بابا کی خاموشی پہ احتجاج کرتی رہی ــــ لیکن ان کی آواز اتنی بلند رہی کہ والد کی آواز دب کر رہ گئی۔

جس طرح انکل حامد کی شخصیت کے آگے میری شخصیت دب گئی۔ انکل حامد تو آپا کے دوست تھے۔ وہ آپا کے دفتر میں آتے جاتے تھے پھر گھر میں آنے لگے ــــ مجھے آپا سے بہت حسد محسوس ہوتا ہے۔ انکل حامد تو میری پسند ہیں ــــ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں ان کی پسند کا لباس کیوں پہنتی۔ اُن کی پسند کے رنگ کیوں استعمال کرتی ــــ انکل حامد کو تصویریں بہت پسند ہیں ــــ میں نے پرانے صندوق میں سے اپنی بنائی ہوئی تصویریں نکالی ــــ سوکھے ہوئے رنگ نکالے ــــ بازار سے جا کر نئے رنگ خریدے ــــ واپس آکر سوکھے رنگوں کی جگہ نئے رنگ صندوق میں رکھ

لیے۔ جیسے رنگ نہیں رنگ والے کو قید کر لیا ہو۔ مجھے یاد ہے جب بچپن میں جگنو مٹھی میں چھپا لیا کرتی تھی تب گگو پوچھتا تھا۔

کیا رنگ سنبھال سکتی ہو؟

کیا تم تتلی پکڑنا جانتی ہو ؟

تب میں اُس سے کہتی تھی۔

جگنو کھو جاتا ہے۔

تتلی اڑ جاتی ہے۔

لمحہ گزر جاتا ہے۔

آج سوچتی ہوں۔ میں ٹھیک ہی کہتی تھی — جگنو کھو جاتا ہے — تتلی اڑ جاتی ہے۔ لمحہ گزر جاتا ہے، انکل حامد آپی میں کھو گئے ہیں۔ خوشی کا رنگ اڑ گیا ہے — میرا لمحہ گزر گیا ہے۔ میں کبھی خوش نہ ہو سکوں گی۔ میں کبھی آپی دین سکوں گی — میں کبھی مثبت سوچ نہ اپنا سکوں گی مجھے منفی سوچ کے گھیرے میں رہنا ہے یہی میرا مقدر ہے — ؟ میں میں ہوں — آپی نہیں — جسے سب پیار کرتے ہیں — جس کی ضرورت سب کو ہے۔ جس کے خواب سچ ہوتے ہیں۔ میں جھوٹی ہوں — میں چھوٹی ہوں — میں اکیلی ہوں۔ میں تنہائی کے دائرے میں زندگی گزار رہی ہوں — کل بھی — آج بھی — کل بھی ملی تنہائی کا دائرہ میرا نصیب ہے — نفرت ہے مجھے اس دائرے سے — ہر دائرے سے — کیونکہ مجھ سے محبت کسی کو نہیں — ہر دائرے کے گرد وقت کی سلاخیں ہیں اور میں مقید ہوں۔ مجھے رہائی چاہیئے۔ مجھے سلاخوں کا جنگل نہیں — محبتوں کا جنگل چاہیئے — آہ — یہ دائرے — یہ سلاخیں اور میں — !

خود شناسی

وہ پہلے میری دوست تھی —

اور بعد میں — ؟

بعد میں مجھے احساس ہوا کہ میں اسے دوست سے کہیں زیادہ حیثیت اور رتبہ دینے لگا ہوں۔

وہ کیسے — ؟

میں اس کا بے انتہا احترام کرنے لگا۔ اس کے سامنے کبھی نشہ نہیں کرتا تھا اور اس سے ملنے کے بعد بھی شراب کا ایک گھونٹ تک نہیں پی سکتا ہوں۔ لگتا ہے پیاس بجھ گئی ہے لیکن جب وہ نہیں ملتی تب سینے کی آگ کو اور بھڑکا لیتا ہوں۔ برسوں پرانی عادت ہے اچانک کیسے چھوٹے گی۔

کیا وہ یہ عادت چھوڑنے کو کہتی ہے — ؟

نہیں — وہ بہت مختلف اور عجیب لڑکی ہے — وہ کسی بھی عادت کو کم کرنے کے لیے کہتی ہے۔ وہ میری زندگی میں آنے والی واحد عورت ہے جو اس عادت کو میری ذات کا حصہ جان کر قبول کئے ہوئے ہے ورنہ تو..... ؟

تم تو سوتے جاگتے ہوئے اُسی کا ذکر کرتے ہو — ان دنوں بہت زیادہ بھی پینے لگے ہو۔ ہاں۔ عجیب بات ہے وہ اس شہر میں ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے — نہ ہی واپس جاتی ہے کہ مجھے چین آجائے۔

کمال ہے۔ اس کے چلے جانے سے تمہیں چین کیسے آئے گا۔ ؟

ملنے کی تڑپ کا اندازہ اور شدت تم نہیں جانتے۔ وہ ہے اور نہیں مل سکتی یہ بات زیادہ اذیت دیتی ہے۔ اگر وہ چلی جائے تب دوسری بات ہے۔ پتہ نہیں وہ میری کونسی نیکی کا صلہ ہے۔ کبھی

کسی کی نہ مانگی ہوئی دُعا قبول ہوئی ہو تو وہ ایسی ہی ہوگی ـــ وہ اسقدر چاہی گئی ہے کہ اب اسے چاہت سے نفرت ہونے لگی ہے ـــ وہ میری بہت سنجیدہ باتوں پر مُسکرا دیتی ہے یا اچانک کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے ـــ اُس کی ہستی میں زندگی ہے ـــ اس کی ہنسی میں جادو ہے۔ مگر جب اُس کی اُداس آنکھوں میں نمی تیر جاتی ہے تب میرا جی چاہتا ہے کہ میں سارے زمانے کی دھوپ سے بچا کر اُسے محبت کی چھاؤں میں بٹھا دوں ـــ لیکن میں تو خود اُس کی چھاؤں کا متمنی ہوں۔ میں سورجوں کی سازش کا شکار ہو گیا ہوں اور وہ اکیلی دھوپ میں جھلس جائے گی۔ یہ تپش اس کے لیے زہر ہے۔ وہ تو بارش کی پہلی بوند جیسی میٹھی، ٹھنڈی اور شفاف ہے۔ اور کسی شعلے کی طرح تلخ ہے ـــ گرم ہے ـــ میں اُسے کیسے سنبھالوں ؟ ہمیشہ کے لیے کیسے اُسے اپنے پاس روک لوں ـــ میں اُس کی زندگی کا مقصد اور مرکز بننا چاہتا ہوں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ناممکن ہے ـــ لیکن ناممکن سے ممکن کا سفر بھی تو ایک پل کا ہے۔ تم میری مدد کرو مجھے بتاؤ میں کیا کروں ـــ ؟

تمہارے اس مسئلے کا میرے پاس کوئی حل نہیں ہے ـــ تمہاری باتوں نے مجھ پتھر کو پگھلا دیا ہے۔ تم سے اس کے بارے میں اتنا سُنا ہے کہ اس کا چہرہ دیکھے بنا بھی اُسے ایک نظر میں پہچان سکتا ہوں ـــ اس سے تو ہر شخص پیار کرتا ہوگا ـــ وہ کس سے پیار کرتی ہے ؟ جس شخص کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا۔ مگر وہ بھی تو اس بارش میں بھیگی ہوگی۔

ہاں اور اگر ابھی تک وہ اس بارش میں نہیں بھیگی تو کبھی ضرور بھیگے گی۔ ہماری تمہاری حیثیت اور ضرورت نہ ہونے کے برابر ہوگی۔ ہمیں تسلیم کر لینا چاہیئے کہ ہم اس کی روح سے نہیں اس کے بدن سے اس کے ظاہری حُسن سے پیار کرتے ہیں ـــ مان لو کہ ہم سب آوارہ کتّوں کی مانند ہیں اور بس !

لمحہ لمحہ

پانچ حصّوں پر مشتمل ایک طویل کہانی

لمحہ لمحہ (۱)

عورت کا تو کچھ بھی اپنا نہیں ہوتا پھر بھی وہ ہر شے کو اپنا سمجھنے کی اداکاری کرتی رہتی ہے۔ ہر وقت یہ بھولنے کی کوشش کرتی ہے کہ اُس کا اپنا آپ بھی اُس کا نہیں ہے۔ سبھی کچھ دوسروں کا ہوتا ہے اپنی تو زندگی بھی نہیں ہوتی۔ مگر اس کٹھن زندگی میں ملنے والے زخموں کا مرہم کوئی تو ہو جسے اپنا کہا اور سمجھا جائے۔

کوئی ایسا فرد جس سے حالِ دل بیان کیا جا سکے لیکن آج کے دور میں اعتماد کس پر کیا جائے؟ کوئی بھی ایسا شخص نہیں۔ حتیٰ کہ اپنی ذات پہ بھی اکثر اعتبار نہیں رہتا۔

انسان ہر لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اعمال، افعال اور ارادے تبدیل ہوتے رہتے ہیں سین چہروں کے حُسن میں کمی آجاتی ہے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ ہنسی کھوکھلی اور مسکراہٹ بے کشش ہو جاتی ہے۔ ذہن اور بدن کی تبدیلیوں کے باوجود کچھ چیزیں بدلنا نہیں جانتیں۔ جیسے فطرت، جیسے جبلت، جیسے احساسات اور جیسے کئی اور باتیں — کئی ہزار — کئی لاکھ — کئی کروڑ باتیں۔

میں بھی ان تمام برسوں میں بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہوں یا پھر یوں کہنا چاہیئے کہ میں نے حالات کے پیشِ نظر کچھ سمجھوتے کر لیے ہیں۔ کچھ سمجھوتے وقت کی مجبوری ہوتے ہیں اور کچھ سمجھوتے ماحول کی مجبوری۔ مجبوری بہر حال مجبوری ہی ہے چاہے وہ اپنی ہو چاہے دوسروں کی۔ میں نے برسوں دوسروں کی خاطر اپنی خواہشات کو قتل کیا اور لاکھوں مرتبہ اذیت کی انتہا سے گزری لیکن سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ برداشت کی تو آخری حد بھی ختم ہو جاتی ہے مگر.....؟

آگ کے دریا سے گزرنا ہی میرا مقدر ہے۔ میں برسوں سے ان دیکھی آگ میں سُلگ رہی ہوں۔ جل رہی ہوں — بہت آہستہ آہستہ اور خاموشی سے مگر اس بات کو کون جان سکا؟ آگ میں

لپٹا بدن اور پھر بدن کی بکھری راکھ دیکھی نہیں جا سکتی۔ کوئی محتسب عدسہ اس نشان کو نہیں دیکھ سکتا۔ تمام آلے ناکام رہتے ہیں جیسے خواہش کا علم کسی کو نہیں ہوتا۔ نہ ہی خواہشوں کو جنم لیتے ہوئے کوئی دیکھ سکتا ہے اور نہ ہی خواہشوں کے قتل پہ آخری سسکی کوئی سُن سکتا ہے۔ لیکن خواہشیں سبھی کرتے ہیں۔ میں نے بھی بہت سی خواہشوں کی چُنری اوڑھی لیکن وقت نے خواہشوں کے ساتھ ہی ساتھ وہ چُنری بھی لیرو لیر کر دی۔ میں بکھرے وجود اور بکھری خواہشوں کی دھجیاں سمیٹنے کی کوشش میں پہلے سے کہیں زیادہ بکھر جاتی ہوں۔ میرا بدن تھکن کے عذاب میں مبتلا ہے۔

میری بے چین روح اطمینان اور سکون کی متمنی ہے۔ میرے اضطراب نے مجھے مضمحل کر دیا ہے، میری پلکیں میرا ماتم کرتے کرتے تھک گئی ہیں اور اب تو آنسو بھی خشک ہو گئے ہیں۔

میری آواز گنگ ہو گئی ہے۔ میرے حرف کھو گئے ہیں۔ میرے وجود کی پرچھائیں مجھے پریشان کرتی ہے۔ میں خود کو تلاش کرتی ہوں اور بہت دُور نکل جاتی ہوں۔ جہاں میں پہلی مرتبہ گُم ہو گئی تھی۔ میں اپنے کھو جانے میں خود کو پا لینے کی جستجو کرتی ہوں۔ بات بہت پرانی ہے۔ اتنی پرانی جتنی پرانی کوئی کہانی ہوتی ہے۔ جتنی پرانی کہانی کے کردار ہو سکتے ہیں۔ گمشدہ کردار۔ اور ایک کھوئی ہوئی کہانی کو میں پھر سے تلاش کرتی ہوں۔

۲

کہانی کہاں سے شروع کروں۔؟

کیا میری کہانی کا پہلا حرف میری پہلی سانس سے لکھا جائے گا۔ کیا میری پیدائش سے۔؟ نہیں۔ اگر پیدائش سے نہیں تو پھر یقیناً بچپن سے۔ ہاں بچپن ہی سے کہانی کا آغاز ممکن ہے۔ لیکن بچپن کا کونسا لمحہ۔؟ شائد وہی بہترین اور بدترین گھڑی جب میں نے پہلی مرتبہ سچ بولا تھا۔ اس وقت مجھے سزا ملی تھی۔ آج تک میری سزاؤں میں کمی نہیں بلکہ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو میری انتہا پسندی ہو سکتی ہے۔ دراصل میں شروع ہی سے اپنی تلاش میں بھٹک رہی ہوں۔ میرے نزدیک خود کو تلاش کرنے کے لیے اپنی ذات کے بارے میں سوچنے کے لیے کوئی نہ کوئی جگہ ضروری تھی۔ اس کے لیے کسی جگہ خصوصاً اپنی جگہ کا ہونا بھی لازم تھا سو اپنا کمرہ ہونا بہت ضروری امر تھا۔ چلیے کمرہ نہیں تو نہ سہی لیکن پھر کوئی کونہ ہی سہی۔ بہت معمولی سی بات لگتی ہے ناں۔ بہت چھوٹی سی خواہش لیکن کوئی بھی خواہش کبھی چھوٹی نہیں ہوتی۔ یہی معمولی اور چھوٹی چھوٹی باتیں بہت بڑی ہو کر سامنے آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کے نتائج خوفناک بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ویسے خوفناک تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہم جسے خلافِ توقع جانتے ہیں اُسے خوفناک سمجھ لیتے ہیں۔ یہ بھی ماننا چاہیئے کہ بعض حالتوں میں اور بعض معاملات میں ہم حقیقتاً ناسمجھ ہی ہوتے ہیں۔ ہماری ہی ناسمجھی کی سزا دوسروں کو انجانے میں اور کبھی کبھی جانے میں ہی مل جاتی ہے مگر ہم بہت سی اہم باتوں کو نظر انداز کرنے کی اور بھول جانے کی عادت ڈال چکے ہیں۔ ہم ان عادتوں کو بدلنے کے لیے قطعاً تیار نہیں جب کہ ہم بیان اس کے برخلاف دیتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی سچ سے گریز ہے۔ چلیں میں آج پھر سچ بولنے کا سبق دھراتی ہوں۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو خود کو بہن بھائیوں اور والدین کے ساتھ ایک دو منزلہ مکان

میں رہتے ہوئے پایا وہ پرانی طرز کا ایک بڑا سا مکان تھا۔ جس میں بہت سی کھڑکیاں، روشندان اور دروازے تھے ــــ روشندان سے چڑیوں کی چہچہاہٹ کے ساتھ ساتھ ہوا بھی آتی تھی۔ کھڑکیوں سے پاس پڑوس کے گھروں، گلی اور قبرستان کو دیکھنے کی آزادی ملتی تھی۔ دروازوں سے رابطے کا کام لیا جاتا تھا یعنی آنے جانے اور گزرنے میں آسانی ہوتی تھی۔ گھر میں گھومنے پھرنے کے علاوہ گھر سے باہر جانے کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ پڑوس میں ایک تو آپی صادقہ تھیں جن کے گھر میں بہت بڑا کنبہ آباد تھا ــــ بہت سے بچے تھے ــــ لڑکوں سے اکثر لڑائی رہتی اور لڑکیوں سے خوب دوستی تھی۔

ہمارے گھر کے برابر میں ایک نعیم کی اماں تھی جو میک اپ کی شوقین تھیں ــــ وہاں جانے سے ہم گریز کرتے تھے۔ ہاں کبھی کبھار گیند چلی جاتی تو اس کے پیچھے ہم بھی بھاگے چلے جاتے یوں ان کا دیدار بھی کر لیتے۔

ایک اور گھر تھا ہمارے گھر کے بالکل سامنے پروین باجی اور ماسٹر کا گھر ــــ دراصل اُس گھر کے سربراہ دینی تعلیم دیتے تھے وہاں کی باجیاں بہت خیال رکھتی تھیں ــــ ماسٹر ایک بگڑا ہوا بچہ تھا جو آج ایک سنورا ہوا شخص ہے ــــ اور رہی مقصود بھائی کی بات تو وہ تو مقصود بھائی تھے۔ جن کے بارے میں ایک مرتبہ میں نے گھر میں سچ کہہ دیا تھا اور اس طرح پڑوس کی لڑکی سے ان کی رقعہ بازی کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔

ایک سہیلی بھی تو تھی ــــ اس کے لیے میں صیبا کمپنی سے بہتر لقب استعمال نہ کر سکی تھی۔ ایک ظفر وغیرہ تھے جن کی بہنوں کے ساتھ میں بھی موٹر میں بیٹھ کر اسکول جایا کرتی۔

ایک گلی چھوڑ کر انجم رہتی تھی اور انجم کے گھر کے بالکل سامنے ککّو رہتا تھا۔ وہاں میں اماں جی سے پڑھنے جایا کرتی تھی ــــ پڑھائی کے بعد اور پڑھائی کے دوران بھی میں اور ککّو کھیلتے رہتے۔ سوال حل کرنے کے بہانے معصوم جملے اظہارِ محبت کے لیے تحریر کرتے، ایک دوسرے کو دکھاتے اور بہت خوش ہوتے۔ اس وقت ڈرامے بھی کرتی تھی ــــ اور گانا بھی خوب گا لیتی تھی ــــ چھت

پہ جا کے تمام محلے کے بچوں کے سامنے رقص بھی ہوتا ــــ داد بھی وصول کی جاتی اور خوب محفل سجائی جاتی۔

ککّو سے برسوں بعد ملاقات ہوئی تو میں پہچان نہ سکی ــــ جب پتہ چلا تو سوچا کاش ہمارے بچپن کی محبت بھی رنگ لاتی اور آج ــــ لوگوں کی طرح میں بھی کہتی ــــ بہت کچھ کہنی۔ لیکن یہ سب فلمی سچوایشنز ہیں ــــ زندگی میں ایسا اوّل تو ہوتا ہی نہیں اگر ہو تو بہت ہی کم ــــ کل آج کیسے ہو سکتا ہے ــــ؟ آج تو وہی ہے۔ سوچ سے نہ تو آج تبدیل ہو سکا نہ ہی کل اور نہ ہی آنے والا کل ــــ زندگی ہماری سوچ سے نہیں دوسروں کی مرضی سے گزرتی ہے۔ دوسروں کے کہے سے چلتی ہے۔ سو یہ عمر بھر کا خواب ہی رہا کہ کاش ایسا ہوتا ــــ ہوتا تو وہی ہے جو دراصل ہونا ہوتا ہے۔ جس کے ہونے میں ہماری رضا یا خواہش کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ ہر ہونی ہو کر رہتی ہے اور انہونی کبھی اتفاقاً ہو جاتی ہے سو اس ہونے اور نہ ہونے کے متعلق سوچنا، چاہنا اور کہنا فضول ہے ــــ مگر ہم بہت سی فضول اور واہیات باتوں کو کرتے رہتے ہیں بلکہ مسلسل کرتے رہتے ہیں۔

۳

آیئے بات پھر وہیں سے شروع کر دیتے ہیں۔ بات اُس پہلے گھر کی ــــ وہ گھر ہمارا گھر نہیں تھا بلکہ کرائے کا مکان تھا۔ جہاں ہر پہلی تاریخ کو مالک مکان کرایہ لینے کے لیے آجاتا تھا ــــ میری پسندیدہ جگہ سٹور روم تھی کیونکہ میں بھی کاٹھ کباڑ کا ایک اہم حصہ تھی۔ مجھے پھینکی ہوئی فالتو اور فضول چیزوں سے بہت پیار ہے۔

جس کمرے میں میں اور میری بہن رہا کرتی تھیں۔ اُس کمرے کی کچھ کھڑکیاں قبرستان میں بھی کھلتی تھیں۔ پہلے پہل مجھے قبرستان سے بہت خوف آتا تھا۔ جب بھی دن کے وقت ہم بچے کھیلتے ہوئے وہاں چلے جاتے تو مائی کبڑو ہمیں ڈانٹا کرتی پھر ہمارا جانا روزمرہ کا معمول ہو گیا تو آہستہ آہستہ اُس نے ہم سے دوستی کر لی بلکہ ہم نے اُسے دوستی کرنے پہ مجبور کر دیا ــــ تب وہ ہمیں قبرستان کی بیری کے نیچے گرے بیر بھی چُننے دیتی اور قبروں پہ اُودھم مچانے سے بھی نہ روکتی ــــ۔

مجھے یاد ہے کئی مرتبہ جب ہم بہت دِنوں تک قبرستان میں نہ جاتے تو مائی کبڑو اپنی اُداسی دور کرنے کے لیے اور ہمارے بلاوے کے لیے پلیٹ بھر کر بیر بھیجتی۔ یہ گویا اس کی محبت کا اظہار تھا جو وہ ہم سے کرتی تھی۔ اُس بیری کے بیر نہایت خوش ذائقہ اور لذیذ تھے آج تک ویسے بیر میں نے کہیں اور کبھی نہیں کھائے۔ میرے لیے تو کبڑو کی بیری ہی اصل بیری ہے ــــ میں قبرستان کے ساتھ ساتھ اُس بیری کو بھی اپنا جانتی ہوں۔ وہی قبرستان جس سے میں خوفزدہ تھی۔ خوف کی ایک وجہ تو لوگوں کی پھیلائی ہوئی جھوٹی سچی کہانیاں تھیں۔ جو اُس عمر میں انوکھی اور ڈراؤنی تھیں خوف کی دوسری اہم وجہ رات کے وقت آنے والے جنازے تھے۔ رات کی تاریکی اور خاموشی میں کبھی سرگوشیاں کبھی بآوازِ بلند کلمۂ شہادت سُننا ایک عجیب تجربہ ہے۔ محسوس ہوتا

تھا کہ جیسے کسی مُردے کو نہیں بلکہ ہمیں مٹی میں دفن کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ڈر بھی ختم ہو گیا اور میں قبرستان کو اپنے وجود کا اہم اور ضروری حصہ جاننے لگی مجھے قبرستان، سٹور روم کے علاوہ مہمان خانے میں بھی تلاش کیا جا سکتا تھا۔ دراصل ہمارے گھر مہمانوں کی اسقدر آؤ بھگت کی جاتی کہ میں خود کو اجنبی اور مہمانوں کو اس گھر کا فرد تصور کرتی۔ انہی مہمانوں میں مجھے اپنی خالہ زاد شازی ملی — شازی میری ہم عمر تھی — ہم دونوں مل کر کھیلا کرتے، گڑیوں کے بیاہ رچاتے رچاتے ہم خود بھی دُلہن بننے کی کوشش کرتے۔ بستر کی چادروں سے ساڑھی باندھی جاتی اور سُرخ رنگ کی پنسل سے ہونٹ سُرخ کئے جاتے — ایک روز والد صاحب سے اتنی ڈانٹ پڑی کہ ایک مدت تک سُرخ رنگ کے متعلق سوچتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا۔ مگر یہ ڈر بھی عارضی ثابت ہوا اور جلد ہی میں سُرخ رنگ کی تصویریں بنانے لگی۔ تصویروں کے بعد لباس اور روح بھی اسی رنگ میں رنگے گئے اور پھر زندگی بھی اسی رنگ سے لکھی گئی۔ سُنا ہے زندگی اور زندگی سے متعلق ہر بات وہ لکھتا ہے جو آسمانوں پر رہتا ہے — جو ہر جگہ رہتا ہے۔ آسمانوں پر رہنے والی بات مجھے زیادہ سچی لگتی تھی شائد اسی لیے میں بچپن میں رات بہت دیر تک تاروں کو دیکھتی تھی یقیناً میں تاروں کے اندر جھانکنے کی کوشش کرتی تھی۔ خالق کو تلاش کیا کرتی تھی جو ہر جگہ موجود ہے لیکن کسی کو نظر نہیں آتا۔ بہت اندھیرا ہو تب بھی کچھ سُجھائی نہیں دیتا اسی لیے میں اندھیرے سے ڈرتی تھی اور بہت زیادہ روشنی میں بھی تو آنکھیں کچھ نہیں دیکھ پاتیں۔ میں نے اُجالے میں بھی بہت تاریکی دیکھی ہے — اسی لیے میں اُجالے سے بھی بہت ڈرتی ہوں۔

الف اُجالا — میں نے الف بے پڑھی تب بھی میں علم سے خوفزدہ تھی۔ جانتی تھی کہ شعور انسانی روح کو جلا بخشتا ہے مگر میں یہ بھی جانتی تھی کہ شعور انسان کو اذیت سے آشنا کرواتا ہے۔ شائد اسی لیے میں نے کبھی بھی اچھی طالب علم ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ایک انگریزی کی استاد مس جوئیس تھیں۔ جنہیں ہم مس بھالو کہتے تھے۔ مجھ پہ اُن کا اتنا رُعب تھا کہ میں اُن کے خوف سے کلاس ورک بھی نہیں کر پاتی تھی۔ ایک روز انہوں نے کاپی دیکھی تو پچھلے کئی صفحے خالی پائے گئے۔ انہوں

نے بہن کو بُلا کر شکایت کی — گھر میں خوب ڈانٹ پڑی۔ اب تک اُن کا خیال آتے ہی لرز جاتی ہوں۔ سوشل اسٹڈیز کی اُستاد مسز میور تھیں۔ انہوں نے چھٹیوں میں ہوم ورک دیا تھا — میں نے ایک گھر بنانے کا بھی وعدہ کیا تھا جو نہیں بنا سکی۔ میری جگہ وہ گھر بھائی نے بنایا تھا۔ مسز میور کی توقع کے برعکس وہ گھر نہایت خوبصورت تھا — وہ حیرت سے دیکھتی رہیں اور کہا — تم تو معجزہ ہو — معجزہ — افسوس تو اس بات کا تھا کہ وہ گھر میرا گھر نہیں تھا بلکہ میرے ماموں زاد بھائی کا گھر تھا — وہی جو آج میرے بہنوئی ہیں۔ میرا گھر تو کہیں کھو گیا تھا یا پھر ملا ہی نہیں تھا پھر میرا گھر کہاں اور کیسا تھا — میں نہیں جانتی تھی لیکن یہ یقین ضرور تھا اور ہے کہ کہیں نہ کہیں میرے گھر کا وجود ہے۔ اگر زمین پر نہ بھی ہو تو ذہن میں تو ہے سارا مسئلہ ذہن کا ہی تو ہے۔ میں بہت کم جماعتوں میں ذہنی طور پہ موجود ہوتی تھی۔ کئی کلاسیں تو مجھے مجبوراً پڑھنا پڑھتی تھیں دراصل جن مضامین کو میں پڑھنا یا جاننا چاہتی تھی وہ مُلک کے کسی سکول کسی نصاب میں نہیں پڑھائے جاتے۔ اب اگر میں آثارِ قدیمہ میں موسیقی میں کلچر اور آرٹ میں فلسفہ اور نفسیات دلچسپی لیتی ہوں تو یقیناً یہ میری خامی ہے۔ میں دُنیا کے بارے میں، تہذیب و ثقافت کے بارے میں، تاریخ کے بارے میں علم حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ میں ڈرامہ، مصوری، ادب موسیقی کی دلدادہ ہوں اور لوگ مجھے روائتی مضامین اور رٹے رٹائے نصاب پڑھانا چاہتے ہیں۔ یوں تو بیشتر اوقات ہم وہی علم حاصل کرتے ہیں جو لوگ ہمیں دینا چاہتے ہیں۔ وہی کچھ کرتے ہیں جو لوگ چاہتے ہیں اس طرح ہم اپنی زندگی کم اور دوسروں کی زندگی زیادہ جیتے ہیں۔ ہماری ذات غیر اہم اور ہمارے اردگرد پھیلے انسانوں کی ذات اہم ہو جاتی ہے چیزوں کی طرح خواہشیں بھی کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دی جاتی ہیں — چیزیں منتقل ہوتی ہیں۔ انسان نقل مکانی کرتے ہیں۔ ہم بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ پر چلے آئے — ۱۲ ریاض اسٹریٹ سے دُور — اُس گلی اُس قبرستان سے بہت دور سمن آباد کی نئی مارکیٹ میں ہم آ گئے۔

اُس گھر کو چھوڑتے ہوئے میں بہت رنجیدہ تھی۔ اسی گھر میں یوں تو کچھ بھی میرا نہیں تھا لیکن ہاں میرے بچپن کے کچھ بکھرے حصے ضرور تھے۔ کچھ شرارتیں، کچھ حماقتیں، کچھ خوشیاں،

کچھ غم بس یہی ان دِنوں کی یادیں تھیں جو میرے لیے بہت انمول تھیں ــــ میری ذات کی کتاب کے کچھ ورق ــ کچھ باب ــ جو میں وہاں چھوڑ آئی تھی ــ جو آج بھی وہیں کہیں ہوں گے مگر کسی کو نظر نہ آتے ہوں گے ــ کسی نے دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی ہوگی ۔ پھر ایسی چیزیں دوسروں کیلئے غیر ضروری اور بے معنی ہوتی ہیں ــ لیکن وہاں گزارے تمام برس ــ ان برسوں کا ہر پل میرے لیے آج بھی بہت ضروری اور بہت بامعنی ہے ــ آج بھی اُس گلی سے گزرتے ہوئے میں کسی اور بچّی کی صورت اپنا بچپن دُھراتی ہوں ــ اپنے ہر تجربے کو زندہ ہوتے دیکھتی ہوں ــ آج بھی پرانی چیزوں کی طرح پرانے دن سنبھالنا میری کمزوری ہے ــ میری عادت ہے ــ میں خود کو بھول نہیں سکتی اس لیے کہ میں خود کو بھولنا نہیں چاہتی ــ میں جانتی ہوں کہ میں نے سفر کا آغاز کب، کہاں سے کیا تھا ــ میرا اصل کیا ہے ــ میرا ماضی کیا تھا؟ ماضی کے بغیر ــ تاریخ کے بغیر کوئی بھی شے مکمل کیسے ہو سکتی ہے ــ میں اس ادھورے پن کے ساتھ نہ رہ سکتی ہوں اور نہ ہی رہنا چاہتی ہوں ــ وہ کل جو وہاں گزرا آج بھی اتنا ہی حسین ہے کہ اس منظر میں میں خود کو جیتا ہوا محسوس کرتی ہوں تو جینے کی خواہش جی اُٹھتی ہے ــ میں جینا چاہتی ہوں ــ اپنی تمام بدصورتی اور اپنی تمام خوبصورتی سمیت ــ یہ میری بُزدلی نہیں ــ میری کمزوری نہیں ــ میری بہادری کی ایک دلیل ہے ۔ میرے ہونے کا ایک ثبوت ہے ــ میں اپنے ہونے کے کسی بھی ثبوت کو کھونا نہیں چاہتی ــ میں اس کل کو بھی اپنے آج کی طرح اپناتی ہوں ۔

I OWN MYSELF AS I AM.

۴

سمن آباد ایک نیا شہر تھا ــ میرے لیے ایک نئی اور بڑی جگہ تھی ــ تب میں نے گلی سے سڑک کا سفر طے کیا ۔ تب مجھے احساس ہوا کہ گلی میں رہنے والوں کے دِل گلیوں جتنے تنگ اور چھوٹے نہیں ہوتے ــ سڑک سے زیادہ بڑے دل ہوتے ہیں ۔ سڑک پہ رہنے والوں کے دل اُن کے ذہنوں کی طرح تنگ و تاریک ہوتے ہیں ــ ۔

نئی مارکیٹ میں یہ ایک خوبصورت مکان تھا ۔ یہاں اچھا وقت گزرا ــ اس گھر کے قریب ایک پارک تھا جہاں ہر شام میں کھیلنے جاتی تھی ــ عجیب بات ہے جب میں ریاض اسٹریٹ میں تھی تب شام کو ہم اکثر باغِ جناح جاتے تھے ۔ اور یہاں ایک چھوٹے سے پارک میں جانا ہوتا ۔ تب باغِ جناح بہت یاد آتا اور سوچتی کاش ہم وہیں رہ جاتے ۔ یہاں آنے سے سب کچھ بدل گیا تھا ــ ویسے تو ہم بہنیں اب بھی ایک کمرے میں رہتی تھیں لیکن کسی کمرے کی کوئی کھڑکی گلی یا قبرستان میں پہلے کی طرح نہیں کھلتی تھی ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہم اس تین منزلہ مکان کی پہلی منزل پہ رہتے تھے ــ جو زمین پر تھی ــ دوسری منزل میں ٹینا وغیرہ تھے اور تیسری منزل پہ کرائے دار شناسائی سے پہلے ہی تبدیل ہو جاتے تھے ۔ اردگرد کو دیکھنے کی بہت خواہش ہوتی تو چھت پر چلے جاتے ــ لیکن یہ چھت اُس چھت سے بہت مختلف تھی ــ پڑوسی اچھے تھے لیکن ویسے نہیں تھے ــ ہمارے ایک پڑوسی تو میرے چچا تھے ۔ اُن کے گھر بہت آنا جانا رہتا ۔ وہاں بہت سی بہنیں تھیں خوب مزا رہتا ــ اُن سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ۔ لذیز اور چٹ پٹے کھانے کھائے اور بھرپور لطف اٹھایا ــ نئی مارکیٹ پرانی مارکیٹ سے زیادہ دُور نہیں تھی ــ وہاں مجھے جونیئر ماڈل اسکول میں داخل کروایا گیا تھا ۔ یہاں بھی غیر نصابی سرگرمیوں میں خوب حصّہ لیتی تھی ــ میری زندگی کا پہلا انعام فینسی ڈریس شو میں پہلا انعام تھا جو مجھے مالن بننے پر ملا تھا ۔ مجھے یاد ہے تب میں نے امّی کی سرخ ساڑھی پہنی تھی ــ ڈھاکہ

کی سوتی ساڑھی جس پر کالا باڈر تھا۔ باوجود میری پسند کے وہ ساڑھی امّی نے کسی اور کو دے دی۔ ساڑھی کا شوق بچپن سے ہی تھا۔

بڑی مارکیٹ اب اتنی بڑی نہیں لگتی تھی جتنی ریاض اسٹریٹ سے سمن آباد ہر اتوار کو آنے پر لگتی تھی۔ ہر اتوار کو ہم سمن آباد آتے۔ بڑی مارکیٹ کے پاس مکین چچا کا گھر تھا۔ وہاں ہم اتوار کی رات کو ٹی۔ وی۔ پر ڈرامہ دیکھا کرتے تھے۔ اور وقار چچا کا گھر تھا جہاں ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ سمن آباد میں کچھ نئے لوگ بھی ملے لیکن بہت سے پرانے جاننے والے بھی تھے۔ کچھ اس وقت کے نئے آج وقت کے ساتھ بہت پرانے ہو گئے ہیں۔ مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ تو پہلے جیسا ہی تھا۔

اس کے بعد میں گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کی گئی۔ یہاں میری تین سہیلیاں تھیں۔ کہکشاں، سمیہ اور رضیہ سلطانہ۔ سکول میں بہت کچھ سیکھا بھی کہ وقت کے ساتھ بہت کچھ اور بھی بدل چکا تھا۔ سکول جاتے ہوئے راہگیروں کی نظروں نے یہ احساس دلایا کہ میں اب بچّی نہیں رہی۔ میں بچّی تو نہیں رہی تھی لیکن لوگوں سے ضرور بچی رہی تھی۔ اسی دوران ہمارا ایک گھر بنا۔ یہ گھر ہمارے پہلے گھر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ پہلے وہاں کھیت ہوا کرتے تھے۔ وہاں جانا اچھا لگتا تھا۔ تب معلوم نہیں تھا کہ وہاں رہنا کس قدر اچھا لگے گا۔ گھر بنا۔ پھر ہم نئی مارکیٹ سے دور کالونی میں اس اپنے گھر میں منتقل ہوئے۔

اس سے پہلے ہم کرائے کے مکانوں میں رہتے تھے یہ ہمارا اپنا مکان تھا۔ ستمبر کا مہینہ تھا جب ایک بار پھر پچھلی یادوں کی گٹھڑی باندھ کر ہم نئی منزل پہ روانہ ہوئے تھے۔ یہاں آ کر میں نے زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھا۔ لوگوں کے اصل چہرے دیکھے تو مجھے شہریوں سے خوف آنے لگا۔ میں پہلے سے کہیں زیادہ محدود اور تنہا ہوتی گئی۔ یہیں میں نے اپنی زندگی کی پہلی نظم لکھی۔ یہاں بھی باشعور ہوئی اور میں نے جانا کہ کچھ نہ جاننا کتنی بڑی نعمت ہے اور جاننا کتنی بڑی زحمت کتنا بڑا عذاب ہے۔ اسی گھر میں میں نے ہنر سیکھے۔ تمام ہنر۔ جنہوں نے مجھے بے ہنر بنا دیا۔ اور میں لوگوں سے علیحدہ ہوتی چلی گئی۔ لوگوں سے دُور جا کر احساس ہوا کہ میں اکیلی بھی ہوں اور تنہا بھی۔!

اسی گھر میں میری بہن اور میرے بھائیوں کا بیاہ ہوا۔ ہر خوشی کے بعد میں زیادہ دکھی ہو جاتی۔ میری تنہائی بڑھ جاتی۔ بہن کے بیاہ کے بعد مجھے اپنے اکیلے پن کا اپنی تنہائی کا بہت شدّت سے احساس ہوا میں نے اب زندگی کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا شروع کیا اور میں نے جانا کہ زندگی تصوّر سے کہیں زیادہ بدصورت اور تلخ ہے۔

تبھی میں دن رات تجربوں کی بھٹی میں سُلگتی رہی، پکتی رہی۔ زندگی کی آگ میں تپش کے ساتھ ساتھ رنگینی بھی ہے۔ حسن بھی ہے۔ لیکن ہوا کے ایک جھونکے کی طرح جو بہت تیزی سے گزر جاتا ہے صرف ایک یاد باقی رہ جاتی ہے۔ حقیقتاً زندگی بہت بے رحم اور ظالم بلا کا نام ہے۔ میں اذیت پسندی کی بنا پر لمحہ لمحہ مرنے پہ مجبور تھی۔ اس کا الزام میں کسی کو بھی نہیں دیتی۔ جس طرح میں اپنی زندگی کے ایک نہیں کئی فیصلوں کا الزام نہیں دے سکتی۔ جب ایک بہت بڑے کالج میں میری رضا کے بغیر میرا داخلہ ہوا۔ جہاں شگفتہ۔ عشرت اور غزالہ نے مجھے سمجھوتہ کرنے پہ بہت مجبور کیا تھا مگر میں ازل کی باغی روح ٹھہری۔ کسی بات کی پرواہ کئے بغیر میں نے کالج چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ کھانے پکانے یا سینے پرونے کے لیے کسی ڈگری کا ہونا ضروری نہیں ہاتھ میں لذّت اور صفائی ہونا ضروری ہے۔ من کی مرضی ہو توجہ سے کام کیا جائے تو کسی بھی کام کو انجام دیا جائے نتیجہ بہتر ہی نکلے گا۔

دوسرے کالج میں اوج اور نیلو نے کسی حد تک خلاف مزاج اشیاء سے سمجھوتہ کرنے کی عادت ڈال دی۔ ہماری دوستی مثالی تھی اور کارنامے لاجواب۔

کالج کی پڑھائی ختم ہوئی۔ گھر میں قرار نہ آیا تو میں ایک نئی دنیا میں چلی گئی۔ یہ نئی دُنیا بہت عجیب نہایت مختلف نکلی۔ میری سوچ سے قطعی مختلف۔ "حرف و صوت کی نگری" جہاں میں نے بہت کچھ سیکھا، جانا۔ برسوں آوازوں کے پیچھے بھاگتی رہی۔ یہاں میں نے بہت سے چہرے دیکھے، کئی روپ دیکھے۔ منافقت اور کذب سے نفرت پہلے بھی تھی لیکن یہاں منافقت اور جھوٹ سے نفرت شدید ہو گئی۔

میں انسانوں سے نہیں اُن کے رویّوں سے، اُن کی حرکتوں سے خوف کھانے لگی۔ مجھے ہر میٹھے جملے کے پیچھے کوئی غرض کوئی مطلب کوئی دھوکہ نظر آتا اور میں سوچتی کیا خلوص متروک الفاظ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ کیا جذبوں کی سچائی ختم ہو گئی ہے ـــ؟ ہاں یہ سب کچھ ختم نہیں تو کم ضرور ہو گیا تھا۔ صرف منافق بھی نہیں تھے بلکہ کچھ کھرے لوگ بھی تھے کئی خوبصورت اور سچے لوگ جن کی وجہ سے میں اس ظالم دُنیا میں جینے کا حوصلہ کر سکی ـــ کچھ لوگوں نے میری خواہش بھی کی شائد اُن کی لگن سچّی نہ تھی ورنہ ـــ؟

یہ بھی ایک سچ ہے کہ میری خواہش کرنا جُرم ہے اور اس کی سزا مجھ سے جدائی کی صورت میں دی جاتی ہے۔ سزا تو سزا ہی ہے ـــ چاہے ایک لمحے کی ہو چاہے عُمر بھر کی ـــ! میں خود بھی تو سزا ہوں، عُمر بھر کی سزا!

۵

پھر وقت نے کروٹ بدلی اور میں جو تمام عمر چھوٹی ہونے کے ناتے دوسروں کا جھوٹا کھاتی رہی، دوسروں کی اُترن پہنتی رہی۔ میرے لیکھ میں لکھنے والے نے ایک ایسا شخص لکھا جس کے لیے عورت کی حیثیت لباس سے زیادہ کچھ بھی نہیں، اسے لباس بدلتے بدلتے لباس بدلتے رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ میں نے اُسے اور اُس کے گھر والوں کو سُکھ دینے کی ہر ممکن کوشش کی اور اُن سب نے مجھے دُکھ دینے کی مسلسل کوشش کی ـــ کامیاب کوشش ـــ!

میں جو کل بھی تنہائی کاٹتی تھی۔ میں آج بھی تنہائی ہی کاٹ رہی ہو ـــ میرا کل ـــ آج اور کل ایک ہیں۔ یہاں بھی میرا اپنا کچھ نہیں تھا ـــ نہ کمرہ، نہ چیزیں اور نہ ہی مرد ـــ! عورت سب کچھ بانٹ سکتی ہے مگر بستر کی چادر کسی اور عورت کے ساتھ نہیں بانٹ سکتی ـــ بانٹنا نہیں چاہتی۔ میں نے ساری زندگی اپنائیت کی۔ اپنے پن کی، اپنی خواہش کی یہ بھول کر کہ میں اس معاشرے کی ایک مختلف سوچ رکھنے والی عورت ہوں جو منفرد ہونے کی سزا ہر گھڑی بھگتتی ہے اور بھگتتی رہے گی۔ جتنا سفر میں طے کر چکی ہوں اتنا میرے اردگرد رہنے والوں نے نہیں کیا ـــ تو کیا شعور حاصل کرنے والے مجرم ہیں؟ کیا ہمارے معاشرے کا مرد احساس کمتری میں ہی مبتلا رہے گا ـــ؟ مرد کب باشعور ہو گا ـــ کب وہ ذہنی طور پہ عورت کو ساتھ چلنے کی اجازت دے گا ـــ؟ کب وہ عورت کو انسان جانے گا ـــ؟

کیا عورت کا المیہ یہ ہے وہ بالغ ہے وسیع النظر ہے اور مرد سے پہلے مرد سے زیادہ میچور ہو جاتی ہے؟ ہمارے معاشرے کا مرد اُسے ہمیشہ عورت ہی کیوں سمجھتا ہے؟ اسے ایک انسان کیوں نہیں سمجھتا؟ بنیادی انسانی حقوق عورت کو کیوں نہیں دیئے جاتے ـــ کب تک عورت، جبر کا شکار رہے گی؟ لمحہ لمحہ کی موت جھیلتی رہے گی۔ اس معاشرے کا مرد جاگی ہوئی عورت کو نیند میں رکھنے

کا حکم کیوں دیتا ہے ؟ کب تک یہ حکم دیا جاتا رہے گا ؟ کب تک عورت ماننے اور حکم مانتے رہنے پہ مجبور کی جاتی رہے گی — آخر کب تک — ؟

لیکن میں خود تو یہ سوال پوچھنے کا حق بھی نہیں رکھتی کیونکہ انہی سوالوں کے جواب میں اُس اُدھورے شخص نے اُس بیٹے ہوئے آدمی نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ دے دیا ہے — جس پہ اُس نے اپنے حکم اور حق کو استعمال کیا ہے — وجہ — ؟ وجہ نہ بھی ہو تو پیدا کی جا سکتی ہے — اور کوئی وجہ ہونا بھی تو ضروری نہیں ہے — کیا ہم نہیں جانتے کہ اصل وجوہات تو صرف حاکمیت کا استعمال اور اظہار جیسی ہوتی ہیں۔ جب مرد نرمی سے مخاطب کرنا نہ جانتا ہو تو وہ چیخ کر پکارتا ہے۔ ان مردوں کے ذہنوں میں معاشرے نے جو کمپیوٹر فکس کئے ہیں انہیں نکلنے اور ضائع ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔ نئے سرے سے پروگرامنگ کرنا ہوگی۔ نئے سرے سے مرد کی تربیت کرنا ہوگی تاکہ وہ انسانوں کی طرح برتاؤ کرنا سیکھے۔ انسانوں کی طرح خود بھی جیئے اور دوسروں کو بھی جینے کا حق دے۔ حق — ہاں اس حق کو استعمال کرنے والے نے وجہ میری ملازمت اور سات بیٹیوں کی ماں ہونا بتائی ہے۔ تو کیا بیٹیوں کی ماں ہونا جُرم ہے ؟ اگر یہی سات بیٹے ہوتے تو میرے ہاتھ میں یہ کاغذ نہ ہوتا جس پہ طلاق کا حرف کئی بار لکھا گیا ہے — کاش کوئی اس حرف کو مٹانا بھی سیکھے — !

میں کس سے فریاد کروں — ؟ کس سے شکوہ کروں ؟ ان انسانوں سے جو خود کو خُدا جانتے اور مانتے ہیں یا پھر اُس سے جو اُن خُداؤں کا بھی خدا ہے — ؟

اپنا چہرہ

پانچ حصّوں پر مشتمل کہانی

اپنا چہرہ (۱)

جب وہ لڑکی پیدا ہوئی تب شائد پہلا چہرہ جو اُس نے دیکھا وہ کمرے کی بوسیدہ چھت کا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ چہرہ اُس پر جھک جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ زندگی کا چہرہ بھی ہمیشہ کے لیے جھک جائے گا۔ اُس نے کمرے کی دیواروں کے سوگوار چہرے دیکھے تھے جن کی اُداسی اور تنہائی میں وہ خود بھی تنہا ہو گئی تھی۔

اُداسی اُس کی رگ رگ میں پھیل گئی تھی تو کیا اُداسی بھی کوئی جرثومہ ہے جو سانس کے ساتھ بدن میں داخل ہو سکتا ہے؟ اُس نے اس بارے میں بہت سوچا تھا اور سوچتے سوچتے وہ تھک گئی تھی۔ تھکن سے گھبرا کے وہ بہت زور سے چیخی تھی۔ خاموش چیخ سارے کمرے میں پھیل گئی تھی پھر شائد وہ رو پڑی تھی مگر لوگ کہتے ہیں بغیر آنسوؤں کے رونا رونا نہیں کہلایا جا سکتا دراصل وہ لوگ خود سے جھوٹ بولتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہی رونا ہے۔ بغیر آنسوؤں کے اندر سے رونے کی عادت اُسے اُسی دن سے پڑ گئی تھی جب وہ پیدا ہوئی تھی۔

اُسے یاد ہے کہ اُس کے بعد اُس نے کھڑکی کا چہرہ دیکھا تھا۔ دراصل وہ کھڑکی سے اُدھر کا منظر دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس کی نظریں کھڑکی کے پیچھے کھڑی دُنیا کو بس دیکھتی ہی رہ گئیں تھیں۔ ایک ایسی دُنیا کی طرف جو اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھی مگر اس دُنیا کو دیکھنے کوشش اور خواہش اُس کی آنکھوں نے کی تھی شائد باہر کی دُنیا حسین تھی، خوبصورت تھی مگر اندر کی دُنیا ــــ اندر کی دُنیا بھیانک اور خوفناک چہروں سے بھری پڑی تھی۔ بدصورت چہرے ارد گرد بکھرے پڑے تھے یہ اُسے بہت بعد میں علم ہوا تھا کہ اس معاشرے میں رہنے والی لڑکی اپنا چہرہ کبھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ تو ساری عمر دُوسروں کے چہروں کے رنگ دیکھتی ہے اور انہی میں اُسے اپنا آپ رنگنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کی نظروں کے اشارے سمجھ کر انہی کے مطابق چلنا پڑتا ہے۔

ان راستوں پہ دُور تک دیر تک سفر کرنا پڑتا ہے جن پر پہلا قدم بھی اُٹھنے کو تیار نہ ہو، ذہن اور دل نہ بھی مانے تب بھی سفر کرنا پڑتا ہے۔ انسانی زندگی کی بہت سی مجبوریوں میں سے یہ بھی ایک مجبوری ہے۔ جسے مجبوری کہنے کی بھی اجازت نہیں ہے بس خاموشی سے مجبوریوں میں رہ کر زندگی کرنا پڑتی ہے۔ اُس کی زندگی کو جانے کس نے عمر بھر اجنبی چہروں اور اور لہجوں کے حُکم ماننے کی سزا اور بددُعا دے دی تھی جسے چُپ چاپ جھیلنے اور سہنے کی اذیت میں وہ مبتلا رہتی۔ اذیت بھی ایک زبردستی کی عادت ہی ہے جسے اپنانا پڑتا ہے ان سمجھوتوں کی طرح جو کرنا پڑتے ہیں۔ بنا چاہے کئے جانے والے سمجھوتے تو بدن کرتے ہیں روح نہیں۔ مگر بدن اور روح کے مسئلے کو بھی کون جانتا یا سمجھتا ہے۔ لوگ جانتے اور سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے، کچھ نہیں سمجھتے کہ یہی ان کی عادت اور ضرورت بن جاتی ہے۔ بننے کو تو اُسے بھی خلافِ توقع خلافِ مزاج اکثر اُن جیسا بننا پڑتا ہے مگر وہ حقیقتاً اُن جیسی کبھی بھی نہ ہو سکی تھی۔ چہرے بدلتے رہتے ہیں، لہجے اور آوازیں بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں مگر ہر چہرہ ہر لہجہ اور ہر آواز عورت کو حُکم دینے والی ہی رہتی ہے۔ کبھی چہرہ ماں کا ہوتا ہے کبھی باپ کا، کبھی بہن بھائیوں کا، پھر عورت شوہر اور اولاد کے چہرے دیکھنے پہ مجبور ہو جاتی ہے اور انہی چہروں اور آوازوں کے حکم سُننے اور ماننے کی مجبوری بھی اُس کے ساتھ ساتھ زندہ رہتی آئی تھی اور وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے اپنا آپ علیحدہ نہ کر سکی تھی — وجہ کوئی بھی ہو اصل شے تو مجبوری کے ساتھ نباہ کرنا ہے۔ چیزوں سے جدا ہوتے ہوئے بھی جُدا نہ ہونا ہے۔ ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ اس ماحول میں نہیں رہتی تھی مگر حاضر اور غائب ہونے کے لمحوں سے وہی واقف تھی۔ کسی اور کو تو علم ہی نہ ہوتا تھا کہ کب وہ باہر کی دُنیا دیکھ رہی ہے اور کب پلٹ کر اُس کی نگاہیں اُس کے اندر کا منظر دیکھتی ہیں۔

دراصل باہر کی دُنیا میں جتنے چہرے تھے اُن میں اُسے اپنے چہرے کی جھلک کبھی نہ دِکھی تھی۔ نفرت، غصے، لاتعلقی اور اجنبیت کے سوا اُسے کچھ نظر نہیں آتا تھا

وہ اپنا عکس دیکھنا چاہتی تھی۔ اُسی طرح قبیلے ہم آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں آنے والے ہر شخص کو لفظوں میں چھو کر دیکھتی کہ کہیں اس میں کوئی مجھ ایسی بات ہے؟ کچھ مجھ ایسا ہے؟

مگر ہر مرتبہ اُسے مایوسی ہوتی بلکہ شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا۔ سب اپنے جیسے ہوتے مگر کوئی اُس جیسا نہ ہوتا، کہیں نہ ملتا، کہیں ملتا تو وہ اپنا سُراغ لگا لیتی۔ خود کو بھی جان لیتی — پہچان جاتی مگر شائد ابھی خود کو دیکھنے اور جاننے کا لمحہ نہیں آیا تھا۔ اُس لمحے کا انتظار ہر آنے والا لمحہ کرتا — ہر جانے والا لمحہ کرتا۔ جانے اُس کے حصے کا لمحہ آنا بھی تھا کہ نہیں —؟ کہیں لاعلمی میں وہ اپنا لمحہ کھو نہ بیٹھی ہو۔ اس درد کی کسک وہی جان سکتا ہے جو خود اس لمحے سے گزرا ہو۔

گزرنے کو تو اُس پر بھی کئی موسم گزرے اور اُس کے ذہن، دل اور بدن پر کئی رتیں خاموش نقش ثبت کر گئیں مگر ہوا کی تحریر کس نے پڑھی —؟ پانی پہ پڑی لکیر کس نے دیکھی؟ کوئی بھی کچھ نہیں دیکھتا — کچھ نہیں پڑھتا اور کچھ نہیں لکھتا۔

لکھتی تو وہ بھی نہ تھی۔ اگر اُسے لکھنا کہتے ہیں تو وہاں وہ سب سے چھُپ چھپ کر ضرور کچھ لکھتی تھی۔ کئی باتیں تو وہ لکھ بھی نہ سکتی تھی کسی کے پڑھ لینے کا خوف شائد ہر خوف سے بڑا خوف ہوتا ہے کم از کم وہ یہی محسوس کرتی تھی۔ اسی لیے ان کہی نظموں کے کئی مجموعے اُس کے ذہن کی الماری میں بند پڑے تھے۔ کسی ایسے وقت کے انتظار میں جب وہ آزادی سے لکھ سکے گی اور پڑھنے والے کا خوف اُس کی راہ سے کہیں دُور جا چکا ہو گا مگر وہ اس لمحے کے بارے میں بھی نہیں جانتی تھی۔ پتہ نہیں اُس کے حصے کی زندگی اُسے کب ملے گی؟ کب اُس کی لکھی اور نہ لکھی ہوئی نظموں کا مفہوم لوگ جانیں گے؟ کب اُسے اپنے جیسے لوگ ملیں گے؟ کب اُس کے حصے کا لمحہ اُسے ملے گا؟۔

آیئے ! ہم بھی اس لڑکی کے ساتھ اس لمحے کا انتظار کریں ۔ اس ایک لمحے کا انتظار جو اُس کا اپنا ہوگا ۔ اُس کے اپنے چہرے جتنا اپنا اور سچا لمحہ ــــ کب وہ اپنا چہرہ خود بھی دیکھ سکے گی ؟ کب اُس کی زندگی میں وہ لمحہ آئے گا جو اُس کا اپنا لمحہ ہوگا ــــ اپنا لمحہ ــــ !

۲

لڑکی نے اپنا چہرہ پہلی مرتبہ دیکھنے کی کوشش کب کی تھی ــــ ؟ یہ بات وہ تقریباً بھول چکی ہے مگر اتنا ضرور جانتی ہے کہ اس کی کوئی کوشش کبھی کامیاب نہیں ہوئی تھی شائد پہلی مرتبہ اسے اپنا چہرہ اُس وقت نظر آیا تھا جب ماں کی انگلی تھامے بازار سے گزرتے ہوئے اُس نے کپڑے کی ایک گڑیا پسند کی تھی اُس سے کھیلنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا مگر کھلونے اور فراک پسند کرتے کرتے اُس نے یہ جان لیا تھا کہ ماں کی آنکھوں نے اس اظہار کے لب سی دیئے تھے ۔ تب وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی تھی ۔ زندگی کو بظاہر اتنا پرسکون درحقیقت اتنا مضطرب دیکھنا اور زندگی کرنا اُس نے اُسی روز سے سیکھا تھا ۔

ایک مرتبہ جب اُس نے اپنا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی تھی تب وہ گھر میں آئی ہوئی معزز خواتین کے سامنے بطور ایک اہم اور نادر شے کے پیش کی گئی تھی ۔ جانے کب تک وہ ان اجنبی چہروں میں اپنا چہرہ تلاش کرتی رہی ۔ خوبصورت نوجوانوں کی آمد اور ان کی تصویریں بھی اس کی مردہ زندگی میں زندگی نہ لا سکیں وہ اتنی ہی بے رنگ اور سرد رہی جتنی پہلے تھی ۔ اُس کا چہرہ بھی بے تاثر ہی رہا ۔ اُس کی زندگی ایک ہی واقعے کو مسلسل دُھراتی رہی وہ جب بھی کسی حوالے سے خود کو دیکھنا چاہتی یا دیکھنے کی کوشش کرتی تو وہ حوالہ کچھ ہی دنوں میں خود کہیں کھو جاتا اور لڑکی تنہا بھٹکنے کے لیے رہ جاتی ۔ تاریکی ہی اُس کی پناہ گاہ ہوتی اور سڑکیں ہی اس کی ہمدرد ۔ وہ ان سڑکوں پہ میلوں پیدل چلتی رہتی ، چلتی رہتی یہاں تک کہ راستہ خود کھو جاتا یا بدل جاتا یا پھر ایک اور بند گلی اُس کا مقدّر بنتی ۔ ۔ ۔ اُسے راستے بھی تو اپنی زندگی کی طرح ٹیڑھے ترچھے پُرپیچ ملے تھے ۔ لوگ بھی خود کو کئی نقابوں میں چھپائے ہوئے ملتے پھر آخر وہ کیا کرتی ــــ ؟ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی ۔

کیا کچھ بھی اصل نہیں ہے ــــ؟ وہ خود تو اصل تھی اور اپنے اصل کی طرف لوٹنا چاہتی تھی مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ اُس کے پاس فوٹو سٹیٹ کاپی ہی پہنچتی ہے اصل تو کہیں کھوئی رہتی ہے یا پھر ملتی ہی نہیں۔ نقل میں اُسے اپنا آپ نظر نہیں آتا تھا یوں تو وہ آئینے کو بھی اصل ہی کہتی تھی کہ آئینہ اُس کا عکس اُسے لوٹا دیتا ہے جب شعاعیں منعکس ہو کر لوٹتی ہیں تو اجالے بکھر جاتے ہیں۔ ویسے تو اُس کا گھر ایک بہت بڑا آئینہ خانہ تھا مگر یہاں بھی کوئی ایسا آئینہ نہیں تھا جو اُس جیسا ہوتا۔ سب مختلف تھے۔ ایک دوسرے کی نقل تھے وہ اصل کی تلاش میں تھی۔ اصل کہاں تھا ــــ؟ اصل کہیں تھا بھی کہ نہیں ــــ یہ بات وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ بہت سی باتیں نہ جانتے ہوئے بھی اسی جاننے کی لگن میں تلاش کا سفر جاری رہتا ہے وہ بھی خود کو کھوج رہی تھی۔ انجانے میں ہی وہ خود کو ڈھونڈتی پھرتی ــــ وہ اپنی تلاش میں بھٹک رہی تھی ــــ بھٹکتی رہتی تھی۔

خود کو تلاش کرتے کرتے ایک روز اپنے گھر سے باہر کسی چہرے میں اُسے اپنا دُھندلا سا عکس نظر آیا۔ ہم ساری عُمر دوسروں میں اپنے آپ کو دیکھنے کی آرزو کرتے رہتے ہیں جہاں بھی اپنا آپ یا اپنا کوئی حصّہ نظر آئے ہم ٹھہر جاتے ہیں ــــ وہ بھی چلتے چلتے رُک گئی تھی۔ تصویروں کی ایک نمائش میں کئی تصویروں کے خیال اور رنگ اُسے اپنی سوچ جیسے لگے تھے اور جب اُس نے ان تصویروں کے خالق کو دیکھا تو جیسے سوچ خود ہی پکار اُٹھی تھی ــــ ہاں ــــ ہاں یہی ہے وہ ــــ کیا یہی ہے وہ؟ لڑکی نے سوچا مگر وہ تو ایک لاتعلقی اور خاموشی سے اپنی تصویریں اور لوگوں کو دیکھتا رہا تھا جیسے کوئی مسافر کسی نئے اسٹیشن پر اُتر کے اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ یہاں پر کیسے اور کیوں آگیا ــــ؟ اب ان لمحوں میں کس دروازے پہ دستک دے ــــ کیا نئے دروازے پہ دستک کے جواب میں دروازہ کُھل جائے گا ــــ؟

اگر ان سوالوں کا جواب ہاں میں ہے تو کیا وہ شخص اُسے خوش آمدید کہے گا؟ کہیں وہ مکیں مکان نہ چھوڑ گئے ہوں؟ پھر اس شہر میں وہ تنہا کیا کرے گا؟ خدشے اور وسوسے کی

پرچھائیں اُس کے چہرے پہ تھی۔ سوالوں کا ہجوم اُس کی آنکھوں میں تھا۔

لڑکی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس مصوّر نے تنہائی کی راتوں اور اُداسی کے دِنوں کا زہر برسوں پیا ہے اور زہر پیتے پیتے بھی اُس نے خوبصورت دنوں کی خواہش ضرور کی ہے۔ اپنی مرضی کے لمحوں کی خواہش۔ مگر پیاس بُجھی نہیں بھلا ایسی پیاس بھی کبھی بُجھا کرتی ہے تب لڑکی کا جی چاہا وہ اس کے پاس جا کر اُس کا ہاتھ تھامے اور برسوں کی اس پیاس میں اپنی پیاس کا جام بھی شامل کر دے اور پھر آہستہ آہستہ مصوّر کی خواہش کے لمحے اُس کے مَن چاہے دن اور راتیں بھی اُس کی زندگی میں کس طرح شامل کر دے مگر افسوس وہ ایسا نہ کر سکی اور اپنی ہی بڑھی ہوئی پیاس کو اور بڑھا کے وہاں سے لوٹ آئی۔ لڑکی لوٹتے ہوئے اُس مصوّر کے چہرے کا رنگ بھی چُرا لے جائیں مردوں کو پتہ ہی نہیں چلتا اور اگر وہ جان بھی لیں تو آگہی کا لمحہ برسوں بعد آتا ہو گا۔ مصوّر کو اگر پتہ چلے گا بھی تو کہیں بہت بعد میں جب وہ خود اس منظر میں دور دور تک موجود نہ ہو گی۔

لیکن مصوّر تو خود رنگ چور تھا اُس نے لڑکی کی چوری دیکھ لی تھی مگر وہ خاموش رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ رنگ لڑکی کی بے رنگ زندگی میں رنگینی لا سکے گا۔ اُسے نئی زندگی دے سکے گا۔

مصوّر کو یہی لگا جیسے اُس نے کسی سادہ کاغذ یا کینوس پہ تصویر بنا کر اُسے ایک نئی زندگی دے دی ہو۔ مصوّر نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی تھی اور بہت سی باتیں کی تھیں۔ لڑکی نے کچھ بھی نہیں کہا تھا اور بہت کچھ کہہ گئی تھی۔ دونوں کے بیچ ایک خاموش اور گہرا تعلق خود بہ خود قائم ہو گیا تھا جس کے لیے شعوری کوشش کسی نے نہیں کی تھی مگر شاید ذہنوں کے کسی کونے میں ضرور ایک دوسرے کی تصویر کا دھندلا عکس موجود رہا ہو گا ورنہ اتنی بے معنی ملاقات اتنی بامعنی ہو یہ کیسے ممکن ہے ــــ؟ ممکنات اور ناممکنات کا دائرہ وسیع ہے کائنات کی طرح ــــ روحوں میں پھیلے سلسلوں کی طرح جنہیں کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی

مگر تعلق موجود رہتا ہے ۔ صرف دریافت کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے صرف موجودگی کا پتہ لگانا ضروری ہے ۔۔۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دریافت کر لیا تھا اور شائد دونوں کو یہ یقین بھی تھا کہ وہ دوبارہ کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ضرور ملیں گے چاہے ملاقات ایک پل کی ہو یا۔۔۔۔!

۳

وہ مصوّر کی تصویری نمائش کا آخری دِن تھا جب وہ دوبارہ ملے ۔ مصوّر کو اچانک بے وقت کی بھوک کا احساس ہُوا۔ وہ نمائش گاہ سے باہر نکلا ہی تھا کہ سیڑھیوں پہ اُس کی ملاقات لڑکی سے ہو گئی ۔ مصوّر جن سیڑھیوں سے اُتر رہا تھا انہی پر دوبارہ چڑھنے لگا تب اُسے محسوس ہوا یہ وہی تھی جو اس گرے ہوئے شخص کو سہارا دے رہی تھی اس کے وجود کو تسلیم کر رہی تھی وہ اُسے پستی سے بلندی کی طرف لے جا رہی تھی ۔ دونوں خاموش تصویر بنے تصویریں دیکھتے رہے ایک دوسرے کو سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے رہے ۔ ان رنگوں اور لکیروں کی باتیں کرتے رہے پھر وہ اسے لے کر ساتھ والے کمرے میں چلا آیا جو ان دنوں اس کی ملکیت تھا ۔ تصویری نمائش کے ختم ہوتے ہی مصوّر کو کئی تصویروں کے ساتھ ساتھ اس کمرے سے بھی جُدا ہونا تھا ۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی لڑکی نے کچھ کہے بغیر میز پہ پڑے ہوئے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالا، سُلگایا ۔۔۔ پہلا کش لیا اور سگریٹ مصوّر کے ہاتھ میں دے دیا پھر وہ خود ہی کمرے میں بنے ہوئے چھوٹے سے کچن کی طرف چلی گئی ۔ چائے کا پانی چولہے پہ چڑھایا ۔ ضرورت کی چیزیں جمع کیں ۔ واپس آئی ۔۔۔ دوسرا سگریٹ سُلگا کر مصوّر کے ہونٹوں سے لگایا ۔ پہلا سگریٹ ختم ہو چکا تھا اب وہ مصوّر کی انگلیوں کو جلانا ہی چاہتا تھا کہ لڑکی نے اپنی انگلیاں جلا ڈالیں ۔ اُسے بجھا کر ایش ٹرے میں رکھا ۔ فرش پہ بکھری راکھ کو دیکھا جو جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی ۔ لڑکی نے مُسکرا کر ایش ٹرے مصوّر کے پاس رکھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس کا استعمال کرنا بھول جائے گا ۔

لڑکی گئی، چائے بنا کر لائی، اُس کے ہاتھوں میں چائے کی دو پیالیاں تھیں ۔ مصوّر نے ممنون نظروں سے لڑکی کو دیکھا ۔ چائے کی پیالی پکڑتے ہوئے اس کا ہاتھ لڑکی کے ہاتھ سے ٹکرایا اُس نے پوچھا ۔

تم کہاں چلی گئی تھیں۔؟

جہاں تم نہیں تھے ــ یا ــ پھر ــ تم تھے ــ میں تھی ــ یا ــ شائد ــ میں بھی نہیں تھی۔

کیا دوبارہ چلی جاؤ گی؟

ہاں ــ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر لڑکی نے سوال کیا۔

سُنو! تم نے وہ تصویر کب بنائی تھی؟

بہت پہلے ــ جب میں نے نئی نئی تصویریں بنانا شروع کی تھیں ــ تب ــ ایک شام میں جانے کہاں کہاں بھٹکتا رہا پھر تھک کر ایک گوشے میں ٹھہر گیا۔ اچانک دیکھا جیسے کوئی .... بس میں اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بہت خوبصورت تھی اور یہ بات میں نے چہرہ دیکھے بغیر ہی جانی تھی۔ مجھے ہمیشہ ہی وہ عورت متاثر کرتی ہے ــ پرکشش لگتی ہے جس کی پُشت .....

(وقفہ)

تمہیں بھی جب میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا ناں اُس روز تم جانے کس کے ساتھ تھیں ــ؟ اُس کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی تم تنہا ہی تھیں۔ میں تمہیں بہت دیر تک دیکھتا رہا تھا۔ میری تصویریں دیکھتے ہوئے تمہارے تمام تاثرات مجھ تک بخوبی پہنچ رہے تھے۔ مجھے بولتے ہوئے کچھ کہتے ہوئے جسم بہت اچھے لگتے ہیں۔ جب چہرہ اور آنکھیں کسی اور سمت دیکھ رہی ہوں۔ جو کچھ بھی دیکھ رہی ہوں۔ دیکھ کر محسوس کریں وہ احساس اُن کے سارے بدن میں چھلکے ــ مجھے یہی ایکسپریشن پسند ہے۔ پھر میں نے واپس آکر کاغذ پہ اُس عکس کا خاکہ کھینچا تھا۔ میری ایک مجبوری ہے کہ میں اجنبی چہروں پہ ادھورے خاکے تو بنا سکتا ہوں مکمل تصویر نہیں۔ میں نے واپس آکر وہ تصویر بنائی تھی۔ مجھے اپنی وہ تصویر بہت پسند ہے اسی لیے میں نے NOT FOR SALE اُس پہ لکھا ہے۔ اپنا آپ کسی کو بھی دینا اپنے ساتھ ظلم ہے۔ میں یہ زیادتی نہیں کر سکتا۔ اُس عورت کے ساتھ میرا وعدہ ہے کہ وہ میرے ہی پاس رہے گی۔

کیا تمہاری اس سے بات ہوئی؟

نہیں مگر میں نے اُس شام خود سے یہ وعدہ کیا تھا اور میں اپنے آپ سے کئے وعدے کبھی نہیں توڑتا۔

REMEMBER - ME AND MY PAINTINGS ARE NOT FOR SALE.

تمہاری تصویریں تو تمہاری ہی ہیں پھر چند پر NOT FOR SALE سلپ کیوں لگی ہے؟

اس لیے کہ اُن چند میں میں ہوں ــ میرا اپنا آپ میرا عکس میرے وجود کا کوئی حصّہ چھپا ہے ــ

یہ میں ہی جانتا ہوں۔ اب تو تم بھی جان گئی ہو۔

ہاں اب تو میں بھی جانتی ہوں اور اس تصویر کو تم نے شام کا نام کیوں دیا ــ؟ جیسے سمندر ہے اور سورج ہے ــ یوں لگتا ہے جیسے پانی میں آگ لگی ہو۔

وہ تصویر دیکھتے ہوئے تم کانپ گئی تھی ناں ــ کیوں؟

میں اپنے اندر کی آگ سے ڈر گئی تھی شائد ــ مجھے وہ منظر بہت خوبصورت مگر خوفناک لگا تھا۔ لڑکی نے جواب دیا۔

پھر پوچھتی ہو میں نے تصویر کا نام شام کیوں رکھا؟ مصوّر نے لڑکی کو گہری آنکھوں سے دیکھا اور کہا شام بھی تو یہی ہے خوبصورت اور بدصورت منظر اور کوئی نہیں ہے۔ شام جُدائی بھی ہے ملاپ بھی۔ سُکھ بھی اور دُکھ بھی۔ اُداسی بھی۔ پناہ بھی اور شام .....

لڑکی نے مصوّر کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا ــ بس ــ اور کچھ نہیں .... میں تمہیں تھوڑا سا سُکھ دے کر اب بہت سا دُکھ دینے چلی ہوں ــ شام ڈھلنے کو ہو گی اب میں چلتی ہوں۔ اگر شام ڈھل گئی تو کہیں نہ جا سکوں گی۔ جانتی ہوں تم یہی چاہتے ہو مگر اب مجھے واپس جانا ہے۔ جانا چاہیئے ــ جانا ہی ہوگا۔

لڑکی مصوّر کو حیران چھوڑ کر دروازے کی طرف چل پڑی۔ مصوّر کی آواز آئی۔

پھر کب ملو گی؟

پتہ نہیں ــــ لڑکی نے پلٹ کے جواب دیا۔

مصوّر نے جواب سُنا اور کہا ــــ میں جانتا ہوں میں جب بھی تمہاری ضرورت محسوس کروں گا تم ضرور آؤ گی۔ یوں تو میں بے چین مسافر ہوں ــــ دن رات اجنبی لوگوں اور اجنبی چہروں اجنبی جگہوں پہ گھومتا رہتا ہوں مگر ایک جگہ ہے جہاں شائد مل جاؤں۔ میرا ایک دوست ہے بہت خوبصورت آواز ہے اُس کی ــــ اُس کے فلیٹ میں دیکھ لینا ــــ پتہ لکھ دیتا ہوں۔

لڑکی نے کاغذ کی بجائے ہتھیلی آگے کر دی اور بولی ــــ ہاتھ پہ لکھی تحریر کبھی نہیں مٹتی ــــ۔

آؤ ــــ تمہیں بس اسٹاپ تک چھوڑ دوں۔

لڑکی اور مصوّر دونوں خاموشی سے روانہ ہوئے بس ایک دو مرتبہ ان کے ہاتھوں نے ایک دوسرے سے باتیں کیں اور بس ــــ۔

تم اُداس مت ہونا ــــ لڑکی نے جاتے ہوئے یہ جملہ کہا جیسے دوبارہ آنے کا عہد کر گئی ہو۔

دونوں کی آنکھوں میں نمی تھی اور ہونٹوں پہ ان کہی باتوں کی پیاس جو وہ بُجھا نہیں سکے تھے۔

مصوّر لڑکی کو چھوڑ کر واپس آیا۔ آدھی رات وہ نمائش گاہ کی تصویروں میں اُس لڑکی کو تلاش کرتا رہا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ کمرے میں واپس آ کر اُس نے پیالی میں بچی ہوئی ٹھنڈی چائے پی ــ سگریٹ سُلگایا ــ زمین سے اُن دو سگریٹ کے ٹکڑوں کو اٹھا کہ میز پہ رکھا جن پر لڑکی کی لپ اسٹک کا نشان رہ گیا تھا جیسے مصوّر نے اُس نشان کو نہیں لڑکی کے ہونٹوں کو چھوا اور محفوظ کر لیا پھر اُس نے کمرے کو ایک آخری نظر سے دیکھا اور اُس فلیٹ میں آ گیا جس کا پتہ اُس نے لڑکی کی ہتھیلی پہ لکھا تھا۔ وہ منظر اس کے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔ وہ لمحہ اس میں جی رہا تھا ــــ اس کی دھڑکنوں میں دھڑک رہا تھا۔

اُس کا دوست گہری نیند سو رہا تھا۔ رات کے آخری پہر جب اُس نے ادھ کھلی آنکھوں سے مصوّر کے ہاتھوں میں کاغذ پنسل کو دیکھا تو نیند میں ہی بڑبڑایا ــ کبھی تو آرام کر لیا کرو۔ آخر تم کیوں اپنے دشمن بنے بیٹھے ہو ــــ

ہاں ــ کر لوں گا آرام مگر آج نہیں ــــ ابھی تو اس کے رنگ مجھے کاغذ پہ اتارنا ہیں ابھی تو اس کے خدوخال مجھے لکیروں میں ڈھالنا ہیں ــــ جیسے وہ میری باتوں کو لفظوں میں بھرے گی۔

کس کا ذکر ہے پیارے ــــ؟ دوست نے نیند سے بوجھل بھاری آواز میں پوچھا۔

بس اپنا ہی ہے ــــ۔

اچھا ــــ مطمئن ہو کر دوست دوبارہ گہری نیند سو گیا جب کہ مصوّر کاغذوں سے باتیں کرتا رہا۔

(دوسرا منظر)

لڑکی گھر پہنچی تو شام رات کے دروازے پہ دستک دے رہی تھی۔

لڑکی نظروں اور جملوں کو نظر انداز کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پہلے اُس نے ادھوری نظم مکمل کی پھر اُس نے اپنی زندگی کی پہلی کہانی لکھی۔ رات صبح کی بانہوں میں اپنا آپ سونپنے کو تھی جب لڑکی ہاتھ میں کاغذ قلم تھامے ہی سو گئی۔ شائد لڑکی نے مصوّر کی باتوں کو کہانی کی صورت دی تھی یا پھر وہ ملاقات کے ان لمحوں کو موت سے زندگی کی طرف لے آئی تھی۔ اس کے ہی جیسے ایک شخص سے اُس کی ملاقات ہوئی تھی ــــ وہ بہت خوش اور اُداس تھی کہ آج اُس نے اپنے چہرے کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ اسی کیفیت میں وہ مطمئن ہو کر گہری نیند سو گئی تھی جب کہ مصوّر جاگ رہا تھا ــــ۔

۴

کئی دنوں سے مصوّر کا بدن تپ رہا تھا۔ بخار کی شدت میں بھی وہ اپنے تخیل کو تخلیق کے روپ میں ڈھال رہا تھا۔ حتیٰ کہ آخری تصویر مکمل ہو گئی۔ برش اُس کے ہاتھوں سے زمین پر گر گیا اور زرد رنگ کی ایک لکیر سی کھنچ گئی۔ برش کے ساتھ مصوّر بھی زمین پر ایک تصویر کی مانند بکھرا ہوا تھا۔

دوست کئی دنوں بعد فلیٹ میں واپس آیا تو مصوّر کی بیماری اس کی منتظر تھی۔ دوست گیتوں بھری شام کے لیے دوسرے شہر گیا تھا اور ایک دن کی بجائے کئی دنوں بعد لوٹ کر آیا تھا۔ اُس نے جیب میں پڑی رقم ٹٹولی اور پھر مطمئن ہو کر ڈاکٹر کو بُلانے چلا گیا۔

مصوّر کئی دنوں تک بیہوش رہا۔ ایک صبح دروازے پہ دستک ہوئی۔ دوست نے دروازہ کھولا لڑکی کو دیکھ کر وہ پہلے تو حیران ہوا مگر کچھ پوچھنے یا کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مصوّر نے گزشتہ دنوں جتنی تصویریں بنائی تھیں۔ جتنے اسکیچ بنائے تھے وہ تمام اُس لڑکی کے عکس تھے۔ لڑکی نے کمرے میں بکھری تصویریں بھی دیکھیں اور بے ترتیبی بھی۔ اُسے دوست کا پریشان چہرہ بھی نظر آیا اور پھر مصوّر کے بیمار وجود نے اُسے کسی اور سمت دیکھنے ہی نہیں دیا۔ میز پہ پڑی دوائیاں بھی دوست کے چہرے کی طرح زرد تھیں اور زمین پہ گرا ہوا برش جس کے ماتھے پہ پیلا رنگ جم گیا تھا، زمین کا کچھ حصّہ بھی اسی رنگ میں رنگا ہُوا تھا۔

لڑکی نے دوست سے کوئی بات کئے بغیر کمرے کا جائزہ لیا اور پھر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ دوست نے خاموشی سے اس کے اس طرح اچانک آنے اور جانے کو دیکھا، پھر پریشان ہو کر وہ مصوّر کے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی کُرسی پر بیٹھ کر سگریٹ

پھونکنے لگا۔ مسلسل چار سگریٹ پینے کے بعد اسی الجھن میں اُس نے نیا گیت لکھنا شروع کیا۔ وہ گیت کا آخری حصّہ لکھ رہا تھا جب لڑکی بغیر دستک دیے دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی، اُس کے ہاتھوں میں کئی پیکٹ تھے۔

دوست نے پہلے سوچا کہ اس کے ہاتھوں سے سامان لے لے مگر پھر گیت مکمل کرنے کے خیال نے اُسے اس نیکی سے روک دیا۔

لڑکی نے تمام پیکٹ میز پہ ڈھیر کر دیئے اور پھر دوست کے پاس آکر اُسے لکھتے ہوئے دیکھنے لگی۔ دوست نے گیت مکمل کیا اور کاغذ لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا۔ سگریٹ کے دھوئیں میں دوست نے لڑکی کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔ لڑکی کا چہرہ بے تاثر تھا یا پھر وہی کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں اُداسی تھی اور ہونٹوں پہ مُسکراہٹ جب لڑکی نے کاغذ دوست کو واپس دیا تو جیسے اُس نے اس گیت کو اور دوست کو شاباش دی۔ لڑکی نے دوست کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا اور اس کے ہاتھ کو تھپکی دی تھی۔ وہ اس اچانک ہونے والے واقعے سے بوکھلا گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے یا کیا کہے۔ تو کیا لڑکی نے اس کی سوچ کو پیار دیا تھا اور اس کے ہاتھوں کی ہمت کو داد دی تھی۔ دوست سوچتا ہی رہ گیا۔

دوسرے ہی لمحے لڑکی نے سنجیدگی سے کام شروع کر دیا جیسے دوست کو پیار کرنا یا داد دینا اُس کے لیے ایک بہت نارمل بات تھی اور یہ ہونی ہوتی ہی رہتی تھی۔ جب کہ دوست اسے انہونی خیال کر رہا تھا۔ لڑکی نے کمرے میں پڑے ہوئے ہیٹر پہ چائے کا پانی رکھا اور میز پہ رکھے لفافے کھولنے لگی۔

دوست کی حیرت میں اضافہ ہو رہا تھا وہ تو پورا جنرل سٹور گھر پہ اٹھا لائی تھی۔ کیا نہیں تھا؟ پھر لڑکی نے نئے لائے ہوئے مگ میں چائے بنا لائی۔ ایک مگ دوست کے ہاتھوں میں تھما یا دوسرا مصوّر کے لیے تھا۔ آج دوست یہ سوچنے پہ مجبور تھا کہ عورت کے پاس آخر ایسا کیا ہے

ہے کہ وہ مُردے میں بھی جان ڈال دیتی ہے؟ کیسا بے سُدھ پڑا تھا مصوّر لیکن اس لڑکی کی محبت اور توجہ سے اُٹھ بیٹھا ہے اگر یہ اسی طرح آتی رہی تو وہ دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔

تب دوست کا جی چاہا کاش کوئی لڑکی ایسی ہی اُس کے لیے بھی آجائے۔ اب سے پہلے وہ اس خواہش کو اظہار کا موقع نہیں دیتا تھا مگر آج۔ آج وہ اسے روک نہ سکا تھا۔ یہ خواہش تو ایسی ضدی بچی تھی جو ہمیشہ ساتھ کے لیے مچلتی تھی، روتی تھی اور جسے چُپ کروانا وہ نہیں جانتا تھا۔

دوست کو کسی بہت اپنے کسی اپنے جیسے کی ضرورت تھی جو اس کی تنہائی کم کر سکتا۔ تنہائی ختم کبھی نہیں ہوتی ہاں کم ضرور کی جا سکتی ہے۔ وہ کب سے کسی ایسے ہی ساتھ کی خواہش کر رہا تھا۔ اب مصوّر کے لیے لڑکی کا ایثار اور محبّت دیکھ کر اُس کی خواہش جاگ اُٹھی تھی وہ مصوّر کو رشک کی نظر سے دیکھ رہا تھا کہ وہ دوست تھا۔ درحقیقت وہ اندر ہی اندر مصوّر سے حسد محسوس کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کاش کوئی لڑکی اس کے لیے بھی اس طرح سے آتی جیسے وہ آئی ہے بہت اچانک مگر بہت قریب یوں جیسے دل میں اتری ہو، ذہن میں چھائی ہو، روح میں در آئی ہو۔

دوست سے جب لوگ سوال کرتے کہ اس کے گیتوں میں اتنا دُکھ اتنی تنہائی کیوں ہے تو دوست سوال کرنے والوں کو حیرت سے دیکھتا۔ کیا یہ واقعی نہیں جانتے کہ میں کسی ایک غم کا شکار نہیں۔ ہزار درد دل میں لیے پھرتا ہوں۔ یہ لوگ میرے دُکھ کا اندازہ کیوں نہیں کرتے۔ تنہائی کی اذیت اور شدت سے کیوں ناواقف ہیں؟ کیوں پوچھتے ہیں کہ آپ ایسے گیت کیوں لکھتے ہیں جنہیں سن کر آنکھ نم ہو جاتی ہے اور تو اور اُس کے گھر والوں نے بھی ایک مرتبہ کہا تھا۔ تم اتنی اُداس چیزیں مت لکھا کرو مت گایا کرو۔ لوگ ہم سے سوال کرتے ہیں کہ تمہیں کیا غم ہے اور پھر وہ ہم پہ شک کرتے

ہیں۔ ہم نے تمہیں کونسے ایسے درد دیئے ہیں جنہیں تم بیان کرتے ہو۔ جن کا اشتہار بنے پھرتے ہو اور شائد وہی اُس گھر میں اُس کا آخری دِن تھا۔ ان لوگوں سے جدا ہوئے اُسے پورے پانچ برس ہو گئے تھے۔ وقت بظاہر کتنی جلد گزر جاتا ہے درحقیقت وقت نہایت آہستہ روی سے گزرتا ہے۔ خصوصاً درد کا موسم کبھی نہیں جاتا۔ ہمیشہ روح میں سسکتا سُنائی دیتا ہے۔ آج پھر دوست بہت پیچھے چلا گیا تھا جہاں سے وہ بھاگ آیا تھا۔ انہی راستوں پہ پلٹ کے دیکھنا کتنا عجیب کتنا مختلف تجربہ ہے۔ تمام تجربے ایک جیسے ہوتے ہوئے بھی علیحدہ علیحدہ سے نظر آتے ہیں۔ جیسے دوست کو لگتا کہ وہ ہمیشہ ایک ہی گیت لکھتا اور گاتا رہا ہے جب کہ لوگ ایسا نہیں سمجھتے تھے۔ لوگ تو یہ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ درد کی تان کبھی نہیں ٹوٹتی۔ لوگ نہیں دیکھتے تھے کہ گیت گاتے گاتے دوست کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ اُس کے گیتوں میں کوک تھی مگر سب کو کہاں سُنائی دیتی تھی۔ اُس کا درد کوئی نہیں جانتا ــــ کاش کوئی تو اُس کا اپنا ہوتا ــــ!

انہی سوچوں میں جانے کب تک وہ الجھتا رہا، الجھتا رہا ــــ یہاں تک کہ ان الجھنوں سے اُس نے خود کو علیحدہ کر لیا اور اپنے لمحے کے لیے سگریٹ کے آخری کش کی طرح آخری دُعا مسلسل دُعا اُس کی سانسوں میں پھیل گئی۔

تو کیا ہر شخص اپنے لمحے کا منتظر ہے۔ جس لمحے کے بارے میں وہ نہیں جانتا کہ وہ آیا بھی ہے یا نہیں ــــ آئے گا بھی کہ نہیں ــــ کب آئے گا ــــ؟

رات گئے جب وہ فلیٹ میں واپس آیا تو اُس کا ذہن سوالوں کی گٹھڑی سے بوجھل ہو رہا تھا اور اس کی روح تھکن سے بے حال تھی۔ اُس نے اپنی تھکن کا علاج نیند کی گولیوں سے کیا اور کچھ ہی دیر بعد سوال خراٹوں کی صورت میں کمرے میں چیخ رہے تھے۔ تھکن دوست کے ہاتھ سے زمین پہ گر گئی تھی۔ زمین کے ماتھے پہ سگریٹ کا داغ تھا جسے وقت کبھی نہیں مٹا سکتا۔ سگریٹ کے داغ تو روح کے داغ ہوتے ہیں۔

ہم دوست مصوّر اور لڑکی کی روحوں کے تمام داغوں کو دیکھ نہیں سکتے تو کیا جان بھی نہیں سکتے؟ ہم ان اذیتوں کو محسوس تو کر سکتے ہیں جو انسانی بدن اور روحیں جھیلتی ہیں۔ درد کی شدت کا اندازہ تو کر سکتے ہیں کہ دُکھ کے رشتوں نے انسانوں کے بیچ پھیلے طویل فاصلے کم کر دیئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے میں زندہ ہوتے اور مرتے شائد یہی ہمارا سُکھ اور دُکھ ہے۔ مان لیجیے کہ ہم ہر پل جیتے اور مرتے ہیں کبھی خود میں اور کبھی دوسروں میں ــــ۔

۵

مصوّر اور لڑکی کی ملاقاتوں میں وقفے طویل ہوئے پھر طویل تر ہوتے گئے یہاں تک کہ پھر ایک طویل فاصلہ رہ گیا اور قربت ختم ہو گئی ۔ دراصل حالات اور وارداتیں اتنی جلد ہوتی ہیں کہ انسان ابھی سنبھلتے بھی نہیں پاتا اور یکے بعد دیگرے روح صدمات سے دوچار ہوتی ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کچھ زندگیاں دلچسپ ہوتی ہیں ۔ درحقیقت دلچسپ زندگیاں نہیں بلکہ زندگیوں میں ہونے والی وہ وارداتیں ہوتی ہیں جو ناگہانی حادثات کی صورت انسانی زندگیوں کے ذاتی اخبارات کی شہہ سُرخیاں بنتی ہیں اور ہم فرد کی ذاتی زندگی کو یکسر نظر انداز کر کے اجتماعی زندگی گزارنے پہ اصرار کرتے ہیں تاکہ افراد معاشرے کے مروجہ قوانین اور اصول اپنائیں ۔ ہم انہیں مخصوص خانوں میں فٹ کرنے کے خواہاں ہیں چاہے ہماری خواہش کے نتیجے میں ذات مسخ ہو جائے ۔ ہم کسی رٹے رٹائے سبق کی طرح بنا سوچے سمجھے انسانوں پہ ظلم کرتے چلے آتے ہیں ۔ اسی طرح کہ ہمیں خود بھی خبر نہیں ہوتی ۔

ہم علم رکھتے ہوئے بھی علم نہیں رکھتے کہ ہمیں معاشرے نے یہی کردار ادا کرنے کی تلقین کی ہے اور ہم آنکھیں بند کئے معاشرے کے احکامات پہ چلتے چلے آ رہے ہیں ۔ ہم نے وقت کو موردِ الزام ٹھہرانا بھی سیکھ لیا ہے یہ بھول کر کہ ظلم وقت نہیں وقت کے لوگ کرتے ہیں ۔

وقت کے لوگوں نے آج بھی مصوّر، لڑکی اور دوست کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا ہے ۔ پہلے مصوّر کے بکھرے وجود کے حصے لڑکی تلاش کرتی رہتی تھی، عادتاً سمیٹتی رہتی تھی یوں اُس کی تکمیل ہوتی رہتی تھی مگر جب لڑکی خود کھو گئی تو مصوّر کی تنہائی کئی گنا زیادہ بڑھ گئی ۔ لڑکی خود نہیں گم ہوئی تھی ۔ اُسے وقت کے لوگوں نے اندھیرے میں چھپا دیا تھا ۔ گھر والوں نے

لڑکی کی شادی ایک امیر خاندان میں کردی تھی ظاہر ہے اُن کے نزدیک یہ بہت بڑی بات، بہت اہم معرکہ تھا جو انہوں نے سر کیا مگر لڑکی کسی بھی ایسے شخص کے ساتھ کیسے نباہ کر سکتی تھی جو اُس کو نہ سمجھتا ہو، نہ جانتا ہو اور نہ ہی جاننے کی کوشش کرتا ہو۔ وہ شخص بظاہر بہت عُمدہ انسان دِکھتا تھا مگر دُکھ یہ تھا کہ وہ بھی اصل نہیں تھا۔

لڑکی اصل کی کھوج میں تھی۔ کسی حد تک مصوّر اسے اصل لگا تھا مگر جو خود کو اصل لگتا ہے وہ دوسروں کی نگاہ میں نقل ہوتا ہے۔ لڑکی اور مصوّر دونوں ہی معاشرے کے بنائے ہوئے مخصوص خانوں میں فٹ نہیں بیٹھتے تھے جب کہ وہ شخص معاشرے کی خواہشوں کے عین مطابق تھا۔ سمجھوتہ کچھ سطحوں پہ بآسانی کیا جا سکتا ہے جب کہ بیشتر جگہوں پہ ناممکن ہوتا ہے۔ لڑکی الجھن میں گرفتار تھی کیا کرے کیا نہ کرے؟

اگر اپنے خوابوں کی کرچیاں اٹھاتی ہے تو لہولہان ہوتی ہے اگر دوسروں کے دِکھائے ہوئے راستے پہ چلتی ہے تو روح کے پاؤں جلتے ہیں۔ لڑکی کب تک انگاروں پہ چلتی۔ آبلہ پائی کا صلہ کہاں ملنا تھا—؟ لڑکی کی منزل تو کوئی اور تھی—یہ سنگِ میل تو خود ہی راستے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ ایک پتھر پہ تقدیر لکھی گئی تھی کب تک وہ پتھر بنی رہتی۔ آخر کار جنوں کی حد سے گزر کر لڑکی نے مزید ظلم نہ سہنے کا فیصلہ کیا۔ یوں تو معاشرہ مطلقہ کو بھی جانے کس کس کردہ اور ناکردہ جُرم کی سزا دیتا ہے اور جو عورت خلع کا حق رکھتے ہوئے اُسے استعمال کرے اُس عورت کو تو زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا ہے۔ ہم آپ آنکھیں بند کر کے بھی چلیں تو زندہ دفن ہوئی عورتوں کی قبروں کے کتبے پڑ سکتے ہیں جو ہم جان بوجھ کر نہیں پڑھتے کہ ہم نہ لکھی ہوئی تحریریں نہیں مانتے۔ ہم حقیقتوں سے گریزاں رہنے والے لوگ ہیں۔

لڑکی کو معاشرے نے بے اولاد ہونے کی سزا دی تھی۔ لڑکی کہتی ہے کاش کوئی جان سکتا کہ میرے اندر کتنی اولادیں زندہ ہیں جو بچے آدھے دِنوں کی موت مرے ہیں وہ بھی تو مجھی کو مارتے رہے ہیں۔ ان کا درد تو آج بھی میرے اندر باہر سانس لیتا ہے۔ لوگوں نے اس

درد کی شدّت محسوس ہی نہیں کی پھر۔۔۔۔ پھر یہ سزا کیسی اور کیوں—؟

لڑکی بنا جُرم کے سزائیں بھگتتے بھگتتے تھک گئی ہے۔

مصوّر تنہائی کی دیوار چاٹتے چاٹتے تھک گیا ہے۔

دوست کی اُداسی اُس کی آنکھ میں ٹھہر گئی ہے۔

کیا یہ زندگی ہے—؟ اگر یہ ناٹک ہے تو ہم نہیں جانتے کہ یہ اس کا پہلا حصّہ ہے، آخری حصّہ یا درمیان کی کوئی ٹوٹی ہوئی کڑی۔۔۔۔

تو کیا ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ لڑکی کا انجام کیا ہوا—؟

دوست کے بکھرے سُر لوٹ کر آئے یا نہیں؟

مصوّر نے تصویریں بنانی کیوں چھوڑ دیں اور وہ ہمیشہ ایک ہی رنگ سے ادھوری تصویر کیوں بناتا ہے—؟

اگر ہم سبھی کچھ جانتے ہیں تو ہم یہ بھی ضرور جانتے ہوں گے کہ کوئی کہانی کہیں ختم نہیں ہوتی۔ زندگی کہانیوں سے زیادہ لمبی ہے ہر موڑ پہ بدل جاتی ہے، ٹھہر جاتی ہے اور چل پڑتی ہے۔ ہر نیا پل نیا آغاز بن جاتا ہے اور روح میں پھیلے رشتوں کے سلسلے پہاڑوں کے سلسلوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ جس طرح کچھ لوگ اپنی عُمروں سے آگے بہت آگے نکل جاتے ہیں۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیئے کہ ہم انسانوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی کچھ نہیں جانتے۔ ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ ہم سب اپنا چہرہ دیکھنے اور تلاش کرنے کی اجازت کسی مصوّر کو یا کسی دوست کو نہیں دیتے بلکہ ہم اپنا چہرہ دیکھنے کی خواہش کرنے والوں کو سنگسار کر دیا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ کوئی بھی ہو سکتی ہے یہ بھی کہ ہمارے اپنے آئینے ٹوٹ چکے ہیں۔ یہ بھی کہ ہمارے حصّے کا لمحہ آ کے گزر چکا ہے اور یہ بھی کہ ہم اذیت پسند اور اذیت پرست ہیں۔ تاریک راہوں میں قتل کرنے کی عادت ہم نے اپنے بزرگوں سے لی اور ہم روشنی سے آنکھیں ملاتے ہوئے ڈر جاتے ہیں۔ ہم خوف کی پیداوار ہیں اور حسد کی ماتا نے ہمارے چہرے بگاڑ دیئے

ہیں مگر آئینے کہاں ہیں کہ ہم خود کو دیکھ سکیں۔ آئینے وقت نہیں ہاتھ چھپا دیتے ہیں۔ کیا ہم بھول جاتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ قلم کر دیئے گئے ہیں اور ہمارے پاؤں برف میں جمے ہیں۔ ہاں۔ بے حسی کی دُھند میں کچھ بھی دِکھائی نہیں دیتا۔ دیکھا تو آنکھوں سے جاتا ہے اور اگر ہم پچھلی تمام باتیں تسلیم کر چکے ہیں تو پھر یہ بھی مان لینا چاہیئے کہ ہم سب اندھے ہیں ــــ!

پہلا قدم (۱)

آج ہم اُس سفر پہ پہلا قدم رکھ رہے ہیں جہاں کبھی کبھی منزل نہیں ملتی۔ یا منزل بہت دیر بعد آتی ہے۔ بہت دُور تک تپتی سیاہ طویل سڑکوں پہ ننگے پاؤں چلنا پڑتا ہے۔ انسان کی تقدیر کی کتاب میں اُس نے حرف اور صرف ایک حرف لکھا ہے "سفر"۔ چلنا، مسلسل چلنا، چلتے ہی رہنا مگر جب تھکن پاؤں پکڑ لیتی ہے اور اُداسی آنسو بن کر سامنے آتی ہے تب انسان کے دُکھ بھی چھالوں کی طرح پھوٹ بہتے ہیں۔ بے انت سفر کی سزا جو عُمر قید سے بھی زیادہ طویل اور سخت ہو جاتی ہے۔ کوئی بھی سزا چھوٹی ہو یا بڑی سزا ہی کہلاتی ہے۔ سزا اذیت کا دوسرا نام ہے اور انسان کتنا ہی اذیت پسند کیوں نہ ہو۔ اس اذیت سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اور کبھی کبھی نجات کے لیے وہ راستے بھی اختیار کرتا ہے جن پر چلنے کو اُس کا دل نہیں مانتا اور کبھی ذہن ساتھ نہیں دیتا۔ نجات کا ایک راستہ دُعا بھی ہے جو ہم عادتاً مانگتے ہیں۔ کبھی کبھی ضرورتاً بھی سزا کے خاتمے کے لیے انسان کی آنکھیں اور ہاتھ ایک ساتھ اُپر اُٹھتے ہیں۔ تب چہرہ سوال بن جاتا ہے اور ہر طرف سوالیہ نشان کے ٹکڑے بکھر جاتے ہیں۔ انسان سوالوں کو جمع کرتے کرتے خود دہی دہی ہو جاتا ہے مگر وہ سوالوں کے جواب نہیں دیتا۔ اُس نے تو بہت پہلے کئی سوالوں کے جواب لکھے تھے، مختلف کتابوں میں لکھے گئے حرف جو آج بھی زندہ ہیں اور جن کی زندگی کا وعدہ اُس نے خود کر رکھا ہے۔ بہت سے وعدوں کی طرح وہ جواب بھی اتنے بھرپور، مکمل اور وسیع تھے کہ انہوں نے ساری کائنات کو خود میں سمیٹ لیا۔ سوال کتنا ہی طویل اور مشکل کیوں نہ ہو ــــ کوئی ایک جملہ، کوئی ایک لفظ بھی اُس کا جواب بن سکتا ہے۔ وہ خود عالمِ اعظم ہے جس نے علم اور عالم کو ایجاد کیا مگر وہ اسے پیدا کرنا کتنا پسند کرتا ہے۔ دریافت کا لفظ انسان نے خود تلاش کیا۔ تسلی کا جذبہ بھی انسان ہی نے دریافت

کیا اور وہ خود کو تمام عمر اسی ایک حرف سے بہلاتا رہا۔ بہلانے کو تو اُس نے بھی انسان کے بہلاوے کے لیے، اپنے بہلاوے کے لیے کائنات تخلیق کی اور کائنات کی ہر شے کو زندگی دی۔

اُس نے تخلیق کے معنی سے انسان کو، کائنات کی ہر شے کو آگاہ کیا، وہ آگہی دیتا ہے، آگاہی دیتا ہے، علم دیتا ہے، علم اور عمل سکھاتا ہے وہ جو سب جہانوں کا رب ہے۔ جس نے انسان کو اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے زندگی کی سزا اور جزا دی۔ وہ جو مکمل قدرت رکھتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ زندگی کیا ہے ــــ؟ زندگی اور موت کا دوراہا کیا ہے؟ جنت کیا ہے ــــ؟ دوزخ کیا ہے؟ عالمِ برزخ کیا ہے؟

وہ تمام حالتیں جن میں انسان برسوں قیام کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو رب بھی ان حالتوں سے گزرتا ہے۔ اور ــــ؟ اور لاکھوں باتیں، کروڑوں باتیں، انہی باتوں سے متعلق باتیں، ان باتوں کا سوال یا جواب باتیں۔ میرے نزدیک تو سوال اور جواب میں کچھ فرق نہیں ہے۔ جس طرح محبت اور نفرت ایک سے شدید جذبے ہیں۔ جس طرح زندگی اور موت یکساں ہے۔ سوال کے جواب سے بھی کئی سوال نکلتے ہیں اور سوالوں کے سلسلے پہاڑوں کے سلسلوں سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ آگے اور آگے بہت آگے ــــ شاید اتنے آگے جتنے آگے آسمان کی پرتیں ہیں۔ خدا کا حقیقی وجود ہے۔ انسان کی سوچ سے ماورا باتیں ہیں کوئی بہت پراسرار اور ان دیکھی دنیا ہے۔ یا ــــ؟ خیر یہ بات تو بہت دور جا نکلے گی ــــ سو پہلے قدم پر ہی رک جانا چاہیئے، پہلے لفظ پر ہی ٹھہر جانا چاہیئے۔ کچھ لوگوں کے لیے پہلی بات ہی آخری بات ہوتی ہے اور کچھ کا پہلا قدم پہلے قدم کے ساتھ ہی چوراہے کی سُرخ بتی راستہ روک لیتی ہے۔ پہلا قدم نیکی یا بدی کی سمت متعین کرتا ہے۔ نیکی، بدی کا راستہ درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔ دو راستوں کے بیچ کھینچی گئی لکیر پہ چلتا رہتا ہے۔ پہلا قدم ہی بتاتا ہے کہ آسان راستے پہ چلنا ہے یا طویل نہ ختم ہونے والے راستوں پہ سفر کرنا ہے۔ پہلا قدم تو فیصلے کا قدم ہے۔ خواب یا حقیقت کا قدم، زندگی یا موت کا قدم، پہلا قدم ــــ پہلا یا آخری قدم، پہلا قدم۔۔۔۔؟

۲

مجھے بھی اُس نے پہلے قدم پہ ہی روک لیا تھا وہ جو میری ہم نام تھی اور میری تلاش میں بہت دور سے چل کر آئی تھی مگر وہ تو شاید اپنی ہی تلاش کا سفر کر رہی تھی۔ اُس کی ماں کون تھی؟ اُس کا باپ کون تھا؟

اس کی ماں وہ عورت تھی جو اپنی زندگی کو محض اپنی زندگی جان کر اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے اُس مرد کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی جو اُس عورت کے لیے اپنا اور میری ہم نام کے لیے بہت پرایا، اجنبی شخص تھا۔ جس سے میری ہم نام کبھی بھی محبت نہ کر سکی۔ بھلا اپنی ماں کے مرد کے ساتھ کوئی اولاد محبت کر سکتی ہے؟ جب کہ وہ ماں بھی ماں بن کر نہ رہی ہو ہاں اُس کی ماں اس شخص سے ضرور محبت کرتی تھی اور ایک وقت میں عورت ایک ہی شخص سے محبت کر سکتی ہے، یا اپنے بدن کے حصّوں سے یا بدن کے شریک سے۔ وہ دونوں سے پیار نہیں کرتی شاید اس لیے کہ وہ خود سے بھی پیار کرنا نہیں جانتی۔ خود سے پیار کرنے والے بہت سوں سے تو پیار کر سکتے ہیں مگر اس کی ماں ان میں سے نہیں تھی۔ ممکن ہے یہی وجہ ہو یا کوئی اور وجہ کہ میری ہم نام اُس عورت سے جو اُس کی ماں تھی اور اس مرد سے جو اسکی ماں کا مرد تھا دور بہت دور ہوتی چلی گئی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُن دونوں نے خود ہی اُسے اور اُس کے بھائی کو خود سے دُور کر دیا ہو) اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی شعوری کوشش سے اُن سے بہت فاصلے پہ کھڑی ہو گئی ہو مگر میں تو اتنا جانتی ہوں کہ وہ سب ایک دوسرے میں رہنا بھول کر ایک دوسرے سے باہر رہتے تھے۔ مجھے قطعی علم نہیں کہ اس کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ میری ہم نام کا بھائی ذہنی مریض کیسے بنا؟ اس کی محرومیوں اور دُکھوں کے بارے میں بھی میں بہت زیادہ معلومات نہیں رکھتی۔ میں نے اُس بھائی کو صرف اپنی ہم نام کی آنکھوں میں دیکھا ہے یا اس کی سسکیوں میں سُنا ہے۔ میں نے ان دونوں کی محبت اور جذبات بھی ہم نام کے لفظوں میں تلاش کیے ہیں اور جانا ہے کہ اس سے زیادہ قربت کہیں ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے

زیادہ کوئی بھی کسی کا خیال نہیں رکھ سکتا جتنا کہ میری ہم نام نے اپنے بھائی کا رکھا ہے اور اتنی نفرت کسی اور سے نہیں کی جا سکتی جتنی میری ہم نام کو اپنی ماں اور باپ سے ہے۔ میری ہم نام کے باپ کے بارے میں بھی مجھے علم نہیں کہ ——— ان باتوں کو فراموش کر کے کہ اس کا باپ بچپن میں مر گیا تھا ——— کیسے؟ جیسے کئی اور باپ مر جاتے ہیں۔ ٹریفک کے حادثے میں، کسی مین ہول میں گر کر ——— بجلی کا جھٹکا لگنے سے ——— پانی میں جہاز ڈوبنے سے ——— کسی ہوائی حادثے میں ——— دل کے دورے سے ——— کسی شناخت نہ ہونے والی بیماری سے ——— کسی پراسرار مُردہ حالت کی صورت میں ——— بس موت کی کوئی بھی شکل ہو بدصورت یہی ہوتی ہے اور انسان رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اُداس اور رنجیدہ ہونے کی وجہ صرف لفظِ موت نہیں ہے بلکہ موت کا ایک بھیانک چہرہ ہے اور اس کے پیچھے نظر نہ آنے والے وہ طوفان ہیں جنہیں ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں وہ خوف اور دُکھ سے سکڑتی پھیلتی رہتی ہیں، نم ہوتی رہتی ہیں۔ میں موت سے نہیں موت کے طریقۂ واردات سے خوفزدہ ہوں۔ مجھے تو موت سے محبت ہے۔ ایک ایسی محبت جس میں اختلافات بدستور قائم رہیں۔ اسی لیے مجھے اپنی ہم نام کے باپ کی موت کا دُکھ ہے۔

اگر میری ہم نام کا باپ ان میں سے کسی طرح کی موت نہیں مرا تب بھی میں افسردہ ہوں۔ اس لیے کہ جیتے جی مرنے کا روگ زیادہ دُکھی کرتا ہے، زیادہ جان لیوا ہوتا ہے۔ اذیت اور غم کی شدت اور احساس بڑھ جاتے ہیں، روحیں کانپتی رہ جاتی ہیں۔ بدن سرد ہو جاتے ہیں۔ سانسیں نوحے کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

میری ہم نام نے زندگی کی تلخ حقیقتیں وقت سے بہت پہلے دیکھ لی تھیں۔ جب کوئی بچی اچانک جوان ہو جائے تو جوانی زندہ نہیں رہتی مر جاتی ہے۔ مجھے اس موت پہ رنج ہوتا ہوتا ہے کہ میں بھی حد درجہ حساس ہوں اور موت کے معنی جانتی ہوں۔ میری ہم نام وقت سے بہت پہلے بہت آگے چلی گئی، جہاں زندگی پرکشش نہیں ہوتی جہاں کوئی رنگ خوبصورت

نہیں ہوتا جہاں زندگی رُک جاتی ہے۔ سب دروازے بند ہو جاتے ہیں اور بند گلیوں میں بھٹکنے والی روحیں کسی ٹھکانے پہ نہیں پہنچتی۔ میری ہم نام بھٹکی روح ہے۔ مضطرب، بے قرار روح جو تھکن سے نڈھال ہے، خاموشی کے لباس میں پھرنے والی کا راز صرف گہری چُپ جانتی ہے اُس کی ہر بات سمجھتی ہے۔ وہ رونما ہونے والے واقعات کا پہلے سے علم رکھتی ہے۔ گہری چُپ جو میری ہم نام جتنی ہی باشعور حساس، زود رنج اور اُداس ہے۔ ان تمام چیزوں پر کسی ایک فرد کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سب تو پاگل ہوائیں ہیں کسے خبر کب کس در پہ دستک دیں۔ کس آنگن میں ٹھہر جائیں۔ کسی منزل سے گزر جائیں ——— کون ان کے راز جان سکا۔ کوئی نہیں ——— نہ میں، نہ تم اور نہ ہی میری ہم نام ———!

۳

میری ہم نام میری ہم سفر بھی رہ چکی ہے اور میں سفر اور ہمسفر سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی اپنی ذات سے کرتی ہوں۔ جہاں بھی مجھے اپنے جیسے لوگوں کی جھلک نظر آئے، اپنا کوئی عکس نظر آئے میں وہیں ٹھہر جاتی ہوں۔ کبھی راستے میں، کبھی چوراہے کے قریب، کبھی کسی درخت کے سائے میں، درختوں کے پتوں اور برہنہ ٹہنیوں سے میرا پیار بہت پرانا ہے۔

یہ بات بھی بہت پرانی ہے جب میری ہم نام نے مرد کا شیطانی روپ دیکھا تھا اور کیا آپ جانتے ہیں کہ میری ہم نام کو لوگوں نے ہر جگہ ہر موقع پر خوب استعمال کیا ہے بلکہ وہ خود استعمال ہوتی رہی ہے۔ میری ہم نام نے برسوں اپنی تنہائی اور محرومیوں کو بدن کی گرمی سے بہلانے کی کوشش کی ـــــ مگر یہ سرد آگ تھی ـــــ میری ہم نام آج تیسری مرتبہ ماں بنتے بنتے رہ گئی ہے۔ اور وہ چلا چلا کر کہتی ہے کہ اس کا پہلا بچہ بھی حرامی تھا جسے اس کے باپ نے اس لیے مروا دیا کہ ایک حرامی دوسرے حرامی کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دوسری مرتبہ میری ہم نام نے خود ہی اسقاط کروا دیا تھا۔ اور اب آج جب وہ معاشرے کے مروجہ قوانین کے عین مطابق ایک بچے کی ماں بننے والی تھی تو اس کے زندہ پیٹ میں بچہ موت کی نیند سو گیا۔ میری ہم نام میرے کاندھے سے لگی گھنٹوں روتی رہی اور کہتی رہی کیا وہ شرع اور مذہب کے مطابق ایک شوہر سے بچہ پیدا کرنے کی بھی حقدار نہیں رہی ـــــ کیا ماں بننے کی خواہش کرنا گناہ ہے۔ کیا گزرے دنوں کے اعمال آج بھی اس کا راستہ روک کے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ کیا آج بھی وہ گناہگار ہے۔؟

میرے پاس اپنی ہم نام کے سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں کہ گناہوں سے توبہ کرنے والی اب پھر گناہ کرے گی ـــــ وہ تو ایک اچھی عورت بن کر رہنا چاہتی تھی۔

ایک اچھی بیوی اور ماں بننا چاہتی تھی مگر وقت کو یہ منظور نہیں ۔ وقت کو اس کی کوئی خوشی گوارا نہیں۔ جب وہ باپ سے محبت کی بھیک مانگنے گئی تھی تب اس کی سوتیلی ماں نے چوری کا الزام لگا کر اسے گھر سے باہر پھینک دیا تھا اور وہ شراب میں اپنا غم شامل کر کے گھونٹ گھونٹ پیتی رہی ۔ اُسے شراب کی تلخی اپنی زندگی سے زیادہ تلخ کبھی نہیں لگی ۔ اُسے کوئی بھی غم چھوٹا نہیں لگا ۔ میری ہم نام تھکن سے بیحال ہے اب وہ اور سمجھوتے نہیں کر سکتی ۔ زندگی کا بیشتر حصہ تو سمجھوتوں میں ضائع ہو گیا اب وہ اپنی ذات کی فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتی ۔ میری ہم نام کو خود پہ حکومت کرنا اچھا لگتا ہے ۔ اب وہ دوسروں کو معاف کرنے کی عادت ترک کر چکی ہے ۔ اب وہ لوگوں کو اُن کا حق دیتی ہے اسی لیے وہ دوسروں سے نفرت اور خود سے کچھ کچھ محبت کرنے لگی ہے ۔

اُسے آج اپنا آپ اچھا لگنے لگا ہے اور وہ سوچتی ہے یہی اس کا اصل روپ ہے ۔ اصل کی تلاش میں وہ نقل ہو گئی تھی اب وہ اپنی طرف لوٹ رہی ہے ۔ ہماری بھولی آج لوٹ رہی ہے تو ہم اُسے خوش آمدید کہیں گے ۔

وہ واپسی کے سفر میں ہے اور آج تو خود میں سود سمیت لوٹ آئی ہے ۔ اب وقت کو اُسکے گناہ معاف کر دینے چاہیں ۔ میری ہم نام برسوں پہلے اپنے کردہ اور ناکردہ گناہوں کا کفارہ ادا کر چکی ہے ۔ وہ کون سا لمحہ تھا ۔؟ آپ بخوبی جانتے ہیں ۔ آئیے ۔ اسی لمحے کا انتظار کریں جب وہ پہلی مرتبہ جی کھول کر مسکرا سکے گی ، خوشی اُسے بھی راس آئے گی ۔ مگر ۔ کب ۔؟ اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے ۔ میری ہم نام بھی نہیں جانتی ۔ شائد اب وہ اتنا بہت جان چکی ہے کہ مزید جاننے کی اُسے خواہش اور ضرورت ہی نہیں رہی ۔ اب ہم اُسے عذاب سہنے کی دعوت نہیں دیں گے کہ ہم جانتے ہیں ۔ اذیت کیا ہے ۔ سزا کیا ہے ۔؟

ہم تو سزا کے خاتمے کی دُعا میں مصروف ہیں ۔ اب ہم عذاب کی دعوت میں شریک نہیں ہو سکتے ۔ نہ میں ۔ نہ آپ اور نہ ہی میری ہم نام ۔!

۴

میری ہم نام کو اپنی ثقافت اور لوک ورثے سے بہت پیار ہے اور وہ محض نام کے لیے نہیں بلکہ حقیقتاً اس کی ترقی کے لیے دن رات مصروف رہتی ہے ۔ میری ہم نام نے نام نہیں کام کمایا ہے ۔ وہ بہت سی تنظیموں میں برسوں سے خفیہ طور پہ کام کر رہی ہے ۔ اس کے علاوہ میری ہم نام کو سیاست کا شعور بھی ہے ۔ وہ بہت عرصہ سے سیاست میں خاموشی سے کام کر رہی ہے ۔ اسے لوگ کوئی بھی نام دیں وہ تو گمنامی میں بھی اسی جوش و جذبے سے مصروفِ عمل ہے ۔ میری ہم نام عجیب و غریب مزاج کی مالک ہے ۔ کبھی تو وہ گزرے دنوں کی یاد میں آنسو بہانے لگتی ہے اور کبھی تمام تعلقات کو ایک ہی لفظ سے منقطع کر دیتی ہے وہ بہت لوگوں سے ملتی ہے بہت مصروف رہتی ہے ۔ کبھی کبھی تو مصروفیت کی بنا پر وہ گھر کا راستہ بھول جاتی ہے ۔ دوسروں کے لیے بہت کام کرنے والے اپنے لیے کبھی کبھی کچھ نہیں کرتے ۔ میری ہم نام کا اپنا کام اکثر ادھورا رہتا ہے ۔ دوسروں کے کام مکمل ہو جاتے ہیں ۔ اُسے اپنے استادوں سے دوسروں کی خاطر باتیں بھی سُننا پڑتی ہیں مگر وہ لوگوں کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی ہے یہ جانتے ہوئے بھی جب اُسے ضرورت ہو گی تب کوئی بھی شخص اُس کے کام نہیں آئے گا ۔ ہاں کچھ دوست ایک عرصے سے اس کا کام کرتے آ رہے ہیں ۔ انہی دوستوں میں سارنگ بھی ہے ۔ سارنگ سے میری ہم نام کی بہت دوستی ہے پھر بھی جانے کیوں وہ اُس سے جھگڑتی ہے اُسے خود پہ قابو نہیں ہے ۔ دوسروں کے کہنے میں آ کر وہ سارنگ کو بھی اپنا دشمن جاننے لگی ہے اور سارنگ کے لیے یہ دُکھ کی بات ہے ۔ سارنگ یہ نہیں جانتا کہ اگر وہ میری ہم نام کی جگہ ہو تب اس سے بھی زیادہ خطرناک مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تو یہ تمام باتیں کہنے کا وہ حق رکھتا ۔ وقت کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا نہیں جانتا اور ایسے سلوک کے بعد عمل اور ردِ عمل اسی نوعیت کے ہوتے ہیں ۔ سارنگ کہتا ہے

میری ہم نام دیوانی ہے۔ ہاں دیوانی نہ ہو تو ایسے دوستوں کو چھوڑ دے۔ مگر وہ اعتبار بھی کرے تو کیسے۔؟ کس پہ اعتبار کرے؟ دوسروں پہ اعتماد کر کے ٹھیس پہنچے تو انسان کا خود پہ بھی اعتماد بحال نہیں رہتا پھر بھی دوسروں پہ اعتماد کرنا پڑتا ہے۔ شائد انسان کی سب سے بڑی غلطی دوسروں سے وابستہ توقعات اور خواہشات ہی رہی ہوگی۔ اس غلطی کو بار بار کرنے پر بھی ہم اسے زندگی بھر دھراتے رہنے پہ مجبور ہیں کہ ہمیں بہر حال زندہ رہنا ہے اور زندہ رہنے کے لیے انسان بہانے تلاش کرتا ہی رہتا ہے۔ زندگی تو بہت کٹھن اور ظالم ہے۔ اس خوفناک رات کے لیے کوئی دیا کوئی جگنو کوئی تارا ضروری ہے ورنہ یہ رات کیسے کٹے گی۔ اس رات کے لیے کچھ دوست، آنکھوں میں کچھ خواب ضرور ہونے چاہیں۔ میری ہم نام بھی اس رات کے لیے دوستوں کے نام اور آنکھوں میں خواب چھپائے پھرتی ہے۔ وہ جینا چاہتی ہے۔ کہتی ہے ــــ میں سمجھی تھی وقت کے ساتھ ساتھ کھال موٹی ہوتی جاتی ہے اور چہرے پہ تھپڑ زور سے نہیں لگتا ــــ مگر میں نے دیکھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کھال پتلی ہوتی جاتی ہے اور تھپڑ زیادہ زور سے پڑتے ہیں۔ میری دوست بھول جاتی ہے کہ ہر تجربہ نیا تجربہ ہوتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان زیادہ حساس ہوتا ہے۔ شعور انسان کی زندگی کے لیے قوتِ مدافعت کا کام نہیں دیتا بلکہ شعور زندگی کم کر دیتا ہے۔ حوصلے بڑھتے نہیں کم ہو جاتے ہیں۔ شعور انسان کو ہر لمحے ایک نئی موت دیتا ہے۔ ہر گھڑی کی موت بہت تکلیف دہ اور اذیت ناک تجربہ ہے۔ انسان ایسی موتیں مرتے ہیں اور مرتے ہی رہتے ہیں مگر سامنے بیٹھے شخص کو بھی ایسی موت کا علم نہیں ہوتا جو دکھ کوئی چھاتی اکیلے ہی جھیلے وہ دکھ شدید اور بے انتہا ہوتا ہے اور یہ سچ ہے کہ ہر انسان تنہا ہی روتا ہے۔ تنہائی ختم نہیں کی جا سکتی ہاں دوسروں کا ساتھ اس تنہائی کو کم ضرور کر دیتا ہے۔ میری ہم نام شدید احساس تنہائی کا شکار ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ تنہائی سے نفرت کرتی ہے۔ تنہائی تو انسانی روح کو مار ڈالتی ہے۔ میری ہم نام ایسی بے کسی کی موت مرنا نہیں چاہتی۔ ہم میں سے کوئی بھی کس طرح کی موت

مرنا نہیں چاہتا مگر موت کو آنا ہی ہے۔ وہ آتی ہے۔ انسان کے بدن اور روح کو فتح کرتی ہے ٹوٹ جاتی ہے۔ ہم موت کو شکست نہیں دے سکتے۔ ہم اس حقیقت کو تسلیم ضرور کرتے ہیں مگر نہایت دکھی لہجے میں کہ موت نے ہمیں مات دے دی۔ موت سب کو مات دے گی اور ہم سب اس کا شکار بنیں گے۔ موت کبھی شکم سیر نہیں ہوتی۔ کس قدر بھوکی ہے یہ موت ــــ تو کیا ہم بھوکے نہیں ــــ؟

ہم سب بھی تو بھوکے ہیں۔ بھوک نے ہم کو جنم دیا اور بھوک ہی ہمیں ہلاک کرے گی یہی اصل حقیقت ہے۔ میں ــــ آپ میری ہم نام ــــ ہم سب جانتے ہیں، مانتے ہیں، مگر جاننا اور ماننا نہیں چاہتے کہ ہم سچ بولنا نہیں چاہتے۔ ہم جھوٹ کی صدی میں پیدا ہونے والے سچ کے تیشے سے مریں گے۔ مگر ہم تو یہ ماننے سے بھی گریزاں ہیں کہ ہم سب منافق ہیں۔ میں ــــ تم ــــ میری ہم نام ــــ ہاں ہم سب منافق ہیں۔ منافق رہیں گے کہ ہمیں زندگی کرنا ہے ــــ!

۵

میری ہم نام مصوّرہ ہے، مجسمہ سازی کرتی ہے۔ پہلا مجسمہ اُس نے اپنا ہی بنایا تھا۔ یہ مجسمہ لوگوں کی نگاہوں میں عریانیت کا شاہکار تھا۔ میری ہم نام نے اپنا برہنہ مجسمہ بنایا تھا کیونکہ اُس نے ہمیشہ خود کو برہنہ ہی دیکھا ہے۔ وہ کہتی ہے میں نے جب بھی لباس پہننے کی کوشش کی مجھے کسی نہ کسی نے بے لباس کر دیا۔ میں برہنہ ہی رہی ہوں، میں برہنہ ہی رہوں گی۔

میری ہم نام نے مصوّری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا وہ جانتی ہے کہ ہمارے یہاں مصوّر کو کتنی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مصوّر کی تصویر دیکھ کر داد تو دی جاتی ہے مگر تصویر خریدی نہیں جاتی کہ مصوّر کو یا فنکار کو دولت جیسی دنیوی شے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ وہی لوگ کہتے ہیں جن کے اپنے نزدیک دولت ہی دراصل معیارِ زندگی ہے۔

میری ہم نام معاشرے کے اس طبقے سے تعلق رکھتی ہے جہاں دولت کی فراوانی ہے مگر یہ کیسی دولت ہے جو انسان کو بے حس بنا دیتی ہے۔ اُسے ہمیشہ یہی احساس ہوا کہ وہ ان سے اس خاندان سے مختلف ہے جبھی وہ کچی آبادیوں کی عورتوں سے ملتی ہے، ان کے مسائل حل کرتی ہے اور بآوازِ بلند کہتی ہے —— دیکھو ان جھگیوں میں رہنے والوں کے درد جانو، اُن کی بھوک پیاس ان کی پُکار سُنو، ان بلکتے بچّوں اور سسکتی زندگیوں میں رہو اور دیکھو زندگی کتنی مہنگی اور موت کتنی سستی ہے۔ یہ بھی عورتیں ہیں جو دن رات محنت مزدوری کرتی ہیں مگر تمام افراد آدھی روٹی کے بھوکے ہی رہتے ہیں۔ ان کے یہاں پیٹ بھر کر کھانا نہیں ملتا —— ان کی آنکھوں کو رات بھر سونا نہیں ملتا۔ وہ نیند کی خواہش کرتے ہیں —— یہ خوابوں میں مُسکراتے اور حقیقت میں آنسو بہاتے ہیں۔ میری ہم نام اُن کے دُکھ بانٹتی ہے جن کی طرف دیکھنے کی بھی اُسے اجازت نہیں ہے۔ میری ہم نام ان عورتوں کے سامنے مصوّرہ کی حیثیت سے نہیں ایک ہمدرد کی

حیثیت سے جاتی ہے مگر اس کا ہمدرد کون ہے؟ اس کے خاندان کے لوگ ابھی تو اس کے ہمدرد نہیں ہیں وہاں تو دولت کا درد انسانوں کے درد سے کہیں زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ اولاد کو جنم دینے والی ماں بھی اولاد کا دُکھ نہیں جانتی پھر سوتیلی ماؤں کا ذکر ہی کیا۔ ماں کا رشتہ تو زیادہ سچا اور زندہ رہنے والا رشتہ ہے لیکن شائد وقت کے ساتھ ساتھ ہر شے بدل گئی ہے میری ہم نام کا باپ کروڑ پتی شخص ہے مگر اس کے نکاح کے وقت اُس باپ نے کہا تھا۔

"تم اپنی تیسری ماں کے نکاح کا جوڑا کیوں نہیں پہن لیتیں، بہت قیمتی اور خوبصورت ہے نیا لباس بنوا کر کیا کرو گی۔؟"

تب اُس نے کہا تھا۔

میں نے ساری عمر کچھ نہیں مانگا ــــ کیا اپنی شادی میں نئے لباس پہننے کی خواہش بھی پوری نہیں ہو سکتی ــــ کیا میرے لیے آپ کے پاس دینے کے لیے اتنا بھی نہیں ہے۔!

حیرت ہے اتنے امیر خاندان کی بیٹی کے بیاہ پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنے کو فضول خرچی سمجھا گیا۔ میری ہم نام نے اپنے جیب خرچ سے بلکہ اپنی کمائی سے پہلے دِن کا جوڑا بنایا اور جہیز دینے کی رسم کو احمقانہ خیال کرتے ہوئے اُسے کچھ نہ دیا گیا۔ کروڑ پتی باپ کی بیٹی خالی ہتھیلی لیے شوہر کے گھر گئی۔

شائد میری ہم نام اور اس کے بھائی دونوں کے لیے والدین کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ تو کیا وہ دونوں قصوروار ہیں ؟ کیا اُس دُنیا میں آنے کا قصور اُن کا ہے؟ کیا اس دنیا میں لانے کے لیے والدین قصوروار نہیں۔ ایسے والدین کا نام تو مل جاتا ہے مقام نہیں۔

کیا اولاد کو پیدا کرنا ہی فرض ہے، ان کے حقوق دینا فرض نہیں تو پھر ایسی اولاد کو پیدا ہی کیوں کیا جاتا ہے؟ اگر پیدا کر دیا جائے تو اپنے ہاتھوں سے ایک ہی مرتبہ زہر کیوں نہیں دیا جاتا۔ ہر لمحہ نئی موت کا چہرہ دیکھنے کے لیے وہ کیوں مجبور کیے جاتے ہیں؟

میری ہم نام کے والدین جیسے کئی والدین ہمارے اردگرد بکھرے پڑے ہیں۔ اِنکی

محبتیں کب جاگیں گی؟ وہ اپنے فرائض سے کب آگاہ ہوں گے؟ وہ اولاد کو اس کا حق کب دیں گے؟ ایسے کئی سوال میری طرح آپ کے ذہن میں بھی ہوں گے مگر ان کے جواب ہمارے پاس نہیں ہیں ان کے پاس ہیں جنہوں نے ان سوالوں کو سوال بننے کی اجازت دی ہے۔

ہم آپ سے پوچھتے ہیں آپ کب تک اولاد کو بے موت مارتے رہیں گے؟ کب تک ان کو سزا دیتے رہیں گے؟ کب تک ان کے خواب قتل کرتے رہیں گے۔ آخر کب تک؟ جواب آپ کے ہونٹوں پہ جم کیوں گیا ہے؟ آپ کی آنکھوں میں ٹھہر کیوں گیا ہے۔ جواب دیجئے ناں۔ کب تک حقیقت سے گریزاں رہیں گے؟ میں ــــ میری ہم نام اور ہم جیسے کئی آپ سے سوال کرتے ہیں۔ اِن سوالوں کو جواب کی تسلی دے کر اپنے احساس گناہ سے نجات حاصل کیجئے ورنہ یہی سوال آپ کے گرد شور مچائیں گے۔ آپ کو جیتے جی مار ڈالیں گے۔ خود بھی زندہ ہوں اور اپنی اولاد کو بھی نئی زندگی دیں۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہی ہوں گے۔ کسی اور کو الزام نہ دیجئے گا ــــ مجرم تو آپ خود ہیں اولاد نہیں۔

۶

میری ہم نام اپنی شادی کو اپنا غلط فیصلہ کہتی ہے۔ مگر کیا اس کا دوسرا فیصلہ یعنی شوہر سے علیحدگی کا فیصلہ درست ہوگا؟ میری ہم نام ایک غلط فیصلے کو دوسرے غلط یا صحیح فیصلے سے تبدیل کر سکتی ہے۔ کون جانے یہ تبدیلی بہتر ہے یا اس کی گزشتہ زندگی سے زیادہ بدتر ثابت ہوتی ہے۔ میری ہم نام علیحدگی کیوں چاہتی ہے؟ اس کا جواب تو وہی دے سکتی ہے۔

ہماری گفتگو کے درمیان جو وجوہات میرے علم میں آئیں وہ تو یہ ہیں کہ میری ہم نام لوگوں سے پہلے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لیتی ہے اور جب وہ توقعات پوری نہیں ہوتیں تو وہ اپنے فیصلے کو اور لوگوں کو غلط ماننے لگتی ہے۔

اس گھر کے گھر نہ بننے کی ایک وجہ میری ہم نام کی سیاست میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اگر وہ سیاست میں دلچسپی کچھ کم اور گھر میں زیادہ کر دے تو یہ مسئلہ بھی حل ہو سکتا ہے۔ اس مسئلے کے حل نہ ہونے کی صورت میں اُسے کئی خطرات اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا جن سے ابھی وہ آنکھیں چُرا رہی ہے۔ وہ بھول رہی ہے کہ پناہ گاہ سے نکلتے ہی بھیڑیے اور گدھ اُسے نوچ ڈالیں گے۔ انسانی روحوں میں پوشیدہ جانوروں کو روکنے کے لیے اس کے شوہر کا وجود بہت کافی ہے۔ اس چھاؤں سے محروم ہوتے ہی اُسے بہت سی چیزوں سے محروم ہونا پڑے گا اور پھر شہر۔ شہر نہیں جنگل کی صورت میں بدل جائے گا۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ میری ہم نام کو شوہر سے کوئی شکوہ نہیں۔ شکوے گلے تو انسانوں کو اشیاء سے بھی ہوتے ہیں لیکن اگر وہ خود کو ایک موقع اور دے تو اس کا گھر بچ سکتا ہے۔ مگر وہ ابھی اس نعمت کی اہمیت سے واقف نہیں ہے۔ اگر وہ اب بھی مضبوط سہارے کی قدر و قیمت جان سکے

تو منظر تبدیل ہو سکتا ہے۔

میری ہم نام نے گھر والوں کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کیا تو انہوں نے بھی یہ فیصلہ سُنا دیا کہ وہ اپنی ذمہ دار آپ ہے۔ گھر والوں سے کسی شے کی توقع نہ رکھے۔ نہ اُسے پناہ ملے گی اور نہ ہی اسے کسی قسم کا کوئی خرچ دیا جائے گا۔

میری ہم نام کے گھر والے یوں بھی ان دنوں خرچ کم کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور انہیں یہ خبر سُن کر بے پناہ مُسرت ہوئی کہ میری ہم نام کا بھائی کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے گویا اب تک جو رقم اس پر ضائع ہوئی اب اس میں اضافہ نہیں ہوگا۔ دراصل وہ اس رقم کے ساتھ ساتھ اُس ذہنی پریشانی کے خاتمے پر جشن منانے کی تیاری کر رہے ہیں جو ایک ذہنی مریض کی وجہ سے ان کے اعصاب پر سوار تھی۔

اب میری ہم نام کی تنہائی سفر کر رہی ہے۔ جب اُس کا بھائی نہیں رہے گا تب وہ کس سے دُکھ بانٹے گی؟ وہ یہ بھول جاتی ہے کہ دُکھ اناج نہیں جسے دوسروں میں بانٹا جا سکے۔ یہی کیا وہ تو بہت کچھ بھولتی اور بھول جانا چاہتی ہے۔ یہ بھی کہ اس نے ایک امیر خاندان میں آنکھ کھولی، اس دُنیا سے بھاگنے کی کوشش میں وہ سیاست میں چلی گئی وہاں بھی تمام مسئلہ مخصوص طبقے کا ہے، سیاست کے بعد اُس نے ایک شخص سے بیاہ کیا مگر یہاں بھی وہ سرمایہ دارانہ مزاج سے علیحدہ نہ ہو سکی۔ وہ خود الجھن کا شکار ہے۔ ایک طرف تو وہ بہت چاہنے پر بھی اپنے طبقے کی ذہنیت سے جُدا نہیں ہو سکتی اور دوسری طرف وہ اس طبقے کے تضادات کی بنا پر ان سے نفرت کرنے پہ مجبور ہے۔ ان سے سمجھوتہ نہیں کر پاتی مگر انجانے میں اس کے اندر اس کے ماحول نے گھر بنا لیا ہے جسے وہ شعوری طور پہ ماننے کو تیار نہیں۔ اس گھر سے نکلنا اس کے اختیار میں نہیں۔ میری ہم نام اپنے کہے سُنے کی گرفتار ہے وہ بھاگ بھی نہیں سکتی کہ اس کے پاؤں دلدل میں دھنسے ہیں۔ ایک دلدل سے نکلتی ہے تو دوسری دلدل میں دھنس جاتی ہے شوہر سے علیحدگی کے بعد کی زندگی بھی تو دلدل ہی ہے۔ وہ یہ بھول جاتی ہے کہ دُنیا ظالم ہے اور

کوئی کسی کا بھلا نہیں کرتا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے اپنے اس کے اپنے نہیں پھر دوسروں سے توقع کیسی۔؟

کیا میری ہم نام نہیں جانتی کہ اس معاشرے میں رہنے والے عورت کو داشتہ بنا کر تو برسوں گھر میں پناہ دے سکتے ہیں مگر عورت کو انسان سمجھ کر کوئی ایک دن بھی پناہ نہیں دیتا۔ عزت کی زندگی گزارنے کے لیے بھی بیشتر لڑکیوں کو اپنی عزت دوسروں کے حوالے کرنا پڑتی ہے۔ ایسا برسوں سے ہوتا آ رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ہم میں سے کون ہے جو اس ہونے کو نہ ہونے کی دُعا دے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو عورت کو جسم ہونے کی گالی تو دیتے ہیں مگر انسان ہونے کا رتبہ نہیں دیتے۔ تو کیا عورت ہونا گناہ ہے؟ اگر یہ گناہ ہے تو اس گناہ کی سزا عمر بھر کی سنگساری ہے؟ یہ سب کیوں اور کس قانون کے تحت ہوتا ہے؟ ہم سب اپنے اپنے قانون بنا کر اپنی اپنی خواہش کی سزا دینے میں مصروف ہیں۔ ہمیں بدلے کی آگ جینے نہیں دیتی، ہم چین سے مرتے نہیں۔ اگر جینا اور مرنا دونوں دوسروں کے اختیار میں ہیں تو پھر ہماری حیثیت کٹھ پتلی سے زیادہ کچھ نہیں۔

میری ہم نام بھی ایسی ہی کٹھ پتلی ہے جس کی ڈور وقت کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کب تک ناچے گی؟ اگر آج وہ اپنا آپ دوسروں کے حوالے کرنے سے انکار کرتی ہے تو کل .....؟ مگر کل کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے یہ بھی نہیں کہ وہ کس طرح جیئے گی، کس طرح مرے گی؟ حیرت کی بات ہے کہ وہ کل بھی ہم ہی بناتے ہیں مگر آج اس کل کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیا ہم بیچ سے خوفزدہ ہیں۔؟ ہاں ہم خود سے خوفزدہ ہیں۔ کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہم نے کل بھی دُکھ کے بیج بوئے اور آنے والے کل میں اذیت کی فصل بھی ہم ہی کاٹیں گے۔ ہم برسوں سے خوابوں کو قتل کر رہے ہیں، کرتے رہیں گے۔ ہمیں سُرخ رنگ بہت عزیز ہے۔ ہم انقلاب دیکھنا چاہتے ہیں انقلاب دیکھنے اور انقلاب لانے میں بہت فرق ہے۔ اب ہم کسی فرق کو نہیں مانتے کیونکہ ہم نے اکثر دیواریں مٹا دی ہیں۔ احساس کی، رشتے کی، تعلق کی دیواریں اب

ہمارے درمیان نہیں۔ جب کوئی دیوار نہ رہے تو بغیر دیوار اور چھت کے گھر میں رہا جاتا ہے۔ ہمیں ایسے مکانوں میں رہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ ہم بُری عادتیں کبھی نہیں بھولتے، کبھی نہیں چھوڑتے.....

ہم نے آنے والی نسلوں کو ورثے میں خوف دیا ہے، اسی لیے ہماری کئی نسلیں عدم تحفظ کا شکار ہو کر دم توڑ چکی ہیں۔ بے حسی کی چادر نے ہمیں دُکھ کی دھوپ سے تو بچا لیا ہے مگر وقت کے بچھو کے ڈنگ سے ہمیں کون بچائے گا ــــ؟

دیوار (۱)

تہمینہ حسن یہ رہی تمہاری ڈاک ــــ اور یہ ہیں ٹیلیفون کے پیغامات ــــ

ایک تو میں تمہارے ان عاشقوں سے بہت تنگ ہوں۔ دِن بھر لوگ تمہیں تلاش کرتے رہتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم مل کر بھی نہیں ملو گی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ لاحاصلی کا دُکھ کیوں سہتے ہیں۔ جانتے بوجھتے ہوئے عذاب سے کیوں گزرتے ہیں؟

شائد اکثر لوگ میری تمہاری طرح اذیت پسند ہوتے ہیں۔ اگر اُن میں اور ہم میں کوئی فرق ہے تو اذیت برداشت کرنے کی صورتیں جُدا جُدا ہیں ورنہ نتیجہ تو صفر ہی رہتا ہے۔ ایک سی کیفیت ہوتی ہے، ایک سی ٹوٹ پھوٹ ــــ بس ردِ عمل مختلف ہوتا ہے۔ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے کوئی انتہا پسند ہوتا ہے اور کوئی اعتدال پسند درد تو جان سے ہی گزرتا ہے۔

تھکن کا احساس کسی کو جلد ہوتا ہے اور کسی کو دیر میں مگر سفر کوئی بھی ہو تھکن راستہ ضرور روکتی ہے ــــ ہے نا ــــ؟

آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔ دفتر میں اتنا بہت سا کام تھا کہ بس پوچھو مت ــــ خود کو انسان سمجھنے کا وقت ہی نہیں تھا۔ صبح سے شام تک کسی جانور کی طرح کام کرتی رہی ہوں۔ ملازمت کی یہی تو ایک خامی ہے کہ انسان کچھ عرصے کے لیے بے حس ہو جاتا ہے۔ کام کے وقت صرف کام اہم ہوتا ہے نہ ذات اہم ہوتی ہے نہ بھوک پیاس یاد رہتی ہے اور نہ ہی کسی کا خیال آتا ہے۔ کام ختم ہونے پر علم ہوتا ہے کہ آپ کو اب دفتر سے گھر جانے کی اجازت اور مہلت مل گئی ہے۔ اب آپ بھی خود کو انسانوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

لیکن اس احساس کے ساتھ ہی دوسرے لمحے تھکن آگھیرتی ہے ــــ تم بھی تھک گئی ہوگی ۔ کیسی ہو ــــ؟ کچھ کھایا پیا بھی ہے کہ نہیں ۔ ؟ میں تم سے ہمیشہ یہی سوال کرتی ہوں ــــ جب کہ میں خود ان کے جواب جانتی ہوں ۔ اسے یقیناً تم میری حماقت ہی سمجھوگی ۔ لیکن میں ہوں ہی ایسی ۔ تمہیں تو پتہ ہی ہے ۔ تم اب تک بھوکی پیاسی بیٹھی ہوگی ۔ کھانے پینے کے معاملے میں تو تم بالکل بچوں جیسی ہو ۔ جب تک کوئی تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلائے پلائے نہیں تم یونہی بھوکی پیاسی بیٹھی رہوگی ۔

پیاری ! زندہ رہنے کے لیے کھانا پینا ضروری ہے ۔ اب تم اٹھو ــــ منہ ہاتھ دھولو ــــ میں تمہارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرتی ہوں ــــ ٹھیک ہے ــــ؟

مجھے بھی اس وقت بہت شدید بھوک لگی ہے ۔ اتنی کہ اس وقت میں کچھ بھی کھا سکتی ہوں ۔

ــــ میں تم مجھے تنہا چھوڑ دو ۔ تنگ مت کرو ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پھر ..... ؟

اور پھر کچھ نہیں ۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں اسی لیے کہتی ہوں ــــ اٹھو ــــ اپنا دھیان بٹاؤ ۔ خود کو مزید پریشان کرنے کا کیا فائدہ ؟ ڈپریشن سے کیا ہوگا ــــ اس طرح اداسی دور ہو جائے گی ؟

پلیز ــــ تم مجھے تنہا رہنے دو ۔ میں خود تمہیں آواز دے لوں گی ۔

ٹھیک ہے تنو ــــ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ ۔ اس سے زیادہ کی اجازت تمہیں نہیں دوں گی ۔ اس سے زیادہ دیر کے لیے تمہیں خاموش رہنے اور اداس دیکھنے کی نہ تو مجھے خواہش ہے نہ ہی کسی اور شخص کو ــــ اس طرح تو کوئی بھی خوش نہیں ہوگا ۔ اور لوگوں کو خوش رہنا چاہیے ہے نا ــــ؟

میں نے دوسروں کو خوش رکھنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ۔

تنو ــــ لڑتی کیوں ہو ــــ؟ چلو بھئی اب ڈرامہ ختم اور زندگی شروع .....!

ڈرامہ ــــ ڈرامہ ــــ ڈرامہ ــــ ہر وقت تو کوئی بھی ڈرامہ نہیں کر سکتا ۔ آخر تم لوگ کب تک میرے ہر سچ کو جھوٹ کہتے رہوگے ۔ ہر وقت تو میں بہروپ نہیں بدل سکتی کبھی تو میں اپنے اصل روپ میں بھی ہوتی ہوں ۔ دیکھو ــــ! اب تم میرا زیادہ دماغ خراب مت کرو ۔ کیا تمہیں میرے گرد گھومنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے ــــ دن رات بک بک ــــ باہر کی جنائتیں بھگتو ۔ گھر آؤ تو گھر میں تم معاف نہیں کرتیں ۔ آخر میں کیا کروں ؟ کہاں جاؤں ؟ بتاؤ ــــ کہاں چلی جاؤں ــــ؟

تنو ــــ تم کبھی کبھی مجھے بہت زیادہ پریشان کرتی ہو ۔ تم خدا کا شکر ادا نہیں کرتیں کہ کوئی تمہارے گرد گھومتا ہے ۔ میں بھی تو دن بھر جھک مارتی ہوں ۔ تم سے بھی بات نہ کروں تو کس سے کروں ؟ سارا دن فائلوں اور ہندسوں میں الجھی رہتی ہوں ۔ انسانی صورتوں میں چھپے بھیڑیوں کی جھوٹی مسکراہٹوں اور منافق چہروں میں پھنسی رہتی ہوں ۔ ان سب کمینے لوگوں سے تنگ آجاتی ہوں مگر انہی رذیل انسانوں میں کام کرنا میری مجبوری ہے ۔ تم سے بات ہو جاتی ہے تو کچھ وقت میں اپنے ساتھ بھی گزار لیتی ہوں ورنہ وہی جھوٹی زندگی ــــ وہی فریب ــــ!

میں ایسی کھوکھلی زندگی سے جیتے جیتے تھک جاتی ہوں ــــ لیکن میری تھکن کم کرنے والا کون ہے ؟ ہر شخص تھکن اور عذاب بڑھا دیتا ہے ۔ عذاب جھیلتے جھیلتے میں اپنے آپ سے تنگ آجاتی ہوں ۔ تھوڑا سا سکھ اور سکون یہی چار دیواری دے سکتی ہے ۔ تم بھی اسی کا ایک حصہ ہو ــــ ہم سب مل کر ایک دوسرے کو زندہ رکھتے ہیں ۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا دلاسہ ہیں ۔ ایک دوسرے کے جینے کا بہانہ ہیں ــــ بہلاوے ہیں ۔ ایک دوسرے کی آس ہیں ــــ میں اور کہاں جاؤں ــــ کس کے پاس جا کر حالِ دل بیان کروں ؟ اپنے اندر کی عورت کی باتیں کس سے کروں ؟ ایک ایسی عورت جس کی بات سننے کے لیے کسی کے پاس وقت نہیں ہے ۔ سب ظاہر پہ نظر رکھتے ہیں ۔ باطن کو

کوئی نہیں جانتا۔ ہر شخص میری مسکراہٹ کو اصل جانتا ہے اور جب کوئی پوچھتا ہے۔ کیا آپ کبھی روئی بھی ہیں؟ تب میں حیران ہو کر سوچتی ہوں — کیا میں کبھی ہنسی بھی ہوں؟

لیکن میں یہ کسی سے نہیں کہہ سکتی — میں اپنی ذات کی کتاب کے اوراق کسی کے سامنے نہیں کھول سکتی یہ میری مجبوری ہے — یہ میرا دُکھ — میرا المیہ ہے — لیکن میری کئی اور مجبوریاں بھی ہیں — کئی ایسے دُکھ بھی ہیں جنہیں صرف تم جانتی ہو — تم —!

آج میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ لیکن ہاں ہم دونوں نے مل کر اس فلیٹ کو گھر بنانے کی کوشش ضرور کی ہے — لیکن یہ آرام گاہ ہے — پناہ گاہ نہیں۔ اور ان دونوں میں بہت واضح فرق ہوتا ہے۔ یہ ہم دونوں جانتے ہیں۔ عورت کی پناہ گاہ تو مرد کی باہیں ہوتی ہیں۔ وہ مرد جو اُس کا اپنا ہو — چند لمحوں کے لیے نہیں — ہمیشہ کے لیے — لیکن یہ بھی دھوکہ ہی تو ہے — کوئی مرد ہمیشہ کے لیے اپنا کیسے ہو سکتا ہے — کسی نہ کسی لمحے وہ چوری کر ہی لیتا ہے۔ جہاں چوری ایک لمحے کی ہو سکتی ہے وہاں گھنٹوں۔ سالوں — عمروں کی بھی ہو سکتی ہے۔

پھر پناہ گاہ کہیں بھی نہیں ہے — عورت تو جھوٹ کی زندگی گزارتی ہے — اور پھر ایک دن سچ کی موت مر جاتی ہے۔ لیکن اس جھوٹی زندگی میں ہی وہ دوسروں کے گھروں کو اپنا جاننے لگتی ہے۔ جیسے میں نے جانا اور سمجھا — لیکن وقت بہت ظالم ہے اُس نے وہ چھت میرے خواب کی طرح مجھ سے چھین لی۔

میں نے خود محنت کی — اسی محنت سے پڑھتی رہی اور ایک دن ایک دفتر میں ملازم ہو گئی۔ میں تو ہر وقت نوکری کرتی — باہر افسر کی اور گھر آ کر گھر والوں کی نوکری بغیر تنخواہ کے کرنا پڑتی۔ پھر ماں باپ نے مجھے بیاہ کر جیسے اپنا فرض پورا کر دیا۔ شروع شروع میں سسرال والے بہت خوش ہوئے کہ کماؤ عورت ہے — چیزوں سے، دولت سے گھر بھر دے گی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ میرے لائے ہوئے جہیز سے وہ اپنی دونوں بیٹیاں بیاہ دیں گے۔ لیکن جہیز ان کی توقع اور سوچ کے مطابق کچھ بھی نہیں تھا۔ انہیں کیا خبر تھی کہ گھر والے میری کمائی پر جیتے ہیں۔ اس سے تو بمشکل گھر

کا خرچ چل سکتا تھا۔ جہیز کے نام کی تو کوئی چیز بھی نہیں بن سکتی تھی۔ ایسی عیاشی کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی جدوجہد کر کے میرے جہیز میں پانچ ہزار روپے آ گئے تھے۔ ہاں — صرف پانچ ہزار روپے —!

میرے سُسرال والوں نے اپنے رشتہ داروں سے یہی کہا تھا کہ لڑکی کے والدین نے ایک فلیٹ دیا ہے۔ جو چیزوں سے بھرا ہوا ہے کچھ دن بعد ہم سب وہاں منتقل ہو جائیں گے۔ لیکن فلیٹ ہوتا تو وہاں جاتے — سو ایک جھوٹ کی خاطر ہزار جھوٹ وہ بولتے رہے۔ سچ تو یہ تھا کہ میرے لیے گھر میں کچھ تھا ہی نہیں کہ دیا جاتا۔ میرے شوہر ایک سرکاری ملازم تھے۔ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود وہ بھی فرسودہ خیالات کے مالک تھے۔ اپنے گھر والوں کی طرح وہ بھی میرے جہیز کے منتظر تھے وہ اس رسم کو بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک بھی انسانوں سے زیادہ چیزوں کی اہمیت اور وقعت تھی۔ جہیز نہ ملنے کی صورت میں میرا صرف بھی کچھ نہ تھا۔ انہوں نے مجھے بہو کا رُتبہ یا بیٹی کا مقام نہیں دیا تھا۔ میں اس لائق ہی کہاں تھی کہ مجھے انسان سمجھا جاتا — میں کسی ملازم کی طرح دِن رات کام کرتی رہتی۔

میرے لیے کچھ بھی نہیں بدلا تھا — بس اتنا ہوا تھا کہ ایک قید خانے سے نکل کر دوسرے قید خانے میں داخل کر دی گئی تھی — جہاں میرے پاس کوئی اپنا نہیں تھا۔ میں کس سے شکایت کرتی؟ نہ تو میرے پاس شکوے شکایت کے لیے کوئی لفظ تھا اور نہ ہی کوئی مہربان جو میری بات سُن سکتا۔ میری تو آواز ہی نہیں تھی — جن کے پاس آواز نہ ہو ان کے پاس لفظ بھی نہیں ہوتی اور خاموشی کی زبان کوئی نہیں سُنتا — کوئی نہیں سمجھتا —!

میرے سُسر بھی میری طرح خاموش رہا کرتے — نندوں نے مجھ سے لاتعلقی ظاہر کر دی تھی۔ وہ حُکم دیتیں یا پھر مجھے اس لائق نہیں سمجھتی تھیں کہ بات کریں — سو اگر کچھ کہتیں تو میرے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح اُن کی آواز ڈالی جاتی۔ میری ساس ہر وقت مجھے بُرا بھلا کہتی رہتیں ان کے ہر وقت کچھ نہ کچھ کہنے کا ہی نتیجہ تھا کہ میرے شوہر نے ہر معاملے میں مجھے قصوروار ٹھہرانے

کا ذمہ لے رکھا تھا۔ ہر کام میں، ہر بات میں غلطی سیمیں کی ہی ہوتی۔

شوہر کو میرا باہر کام کرنا تو پسند تھا — کہ ہر ماہ ان کی ہتھیلی میں نوٹ آ جاتے تھے۔ لیکن وہ میرے ساتھ کام کرنے والوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کے بقول دفتر کے ہر شخص سے میرے ناجائز تعلقات تھے — جب وہ ہر شخص پہ شک کرنے لگتے تب وہ خود بہت چھوٹے دکھائی دینے لگتے تھے۔ پست ذہنیت اور شکی مزاج مرد کسی بھی عورت کی زندگی میں نہ آئے، ورنہ جینا سزا ہو جاتا ہے۔ میں بھی برسوں یہ سزا جھیلتی رہی۔ ایک دن اُن لوگوں نے مجھے گھر سے باہر پھینک دیا — میں فالتو شے جو تھی — بے مصرف تھی اسی لیے میرے ساتھ یہ سلوک کیا گیا۔ کئی ماہ تک مسلسل خاموشی رہی — مجھے علم تھا یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ ہو گی۔ میں خوفزدہ رہی — ان سے ہر قسم کی توقع کی جا سکتی تھی اسی لیے میں اندر ہی اندر کانپتی رہی کہ کون جانے کس گھڑی کیا ہو جائے —؟

کچھ عرصے بعد مجھے طلاق نامہ ملا۔ وجہ میری بدچلنی اور اولاد کا نہ ہونا لکھی تھی — میں اس لمحے تک بدچلن نہیں تھی جب مجھے کاغذات ملے۔ اولاد نہ ہونے کی بات — ڈاکٹروں کے مطابق مجھ میں خامی نہیں تھی — لیکن ہر الزام ہمیشہ عورت ہی کو دیا جاتا ہے۔ شبہہ ہمیشہ عورت پر ہی کیا جاتا ہے۔ مرد کے بارے میں نہ اُس کے گھر والے اور نہ ہی وہ خود یہ سوچتا ہے کہ اس میں کوئی خامی ہو سکتی ہے۔ میرے شوہر نے بھی اپنے عیب کی پردہ پوشی کی تھی۔ اس نے اپنی بجائے مجھے قصوروار ٹھہرایا تھا۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ کوئی بھی میری بات کو اہمیت نہ دیتا۔ مجھے اس بات پر لوگ ایسے دیکھتے جیسے میں نے کوئی گناہ کیا ہو؟

جس گھر میں میں نے جنم لیا تھا انہوں نے بھی مجھے ہی مجرم کہا اور مجھے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ میں اپنے بجائے شوہر کی کمزوری کا تذکرہ بھی کروں۔ سب سے بڑی رکاوٹ تو گھر والے ہی ہوتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھ میں گُن ہی نہیں کہ میں اپنا گھر بسا سکوں — اپنے شوہر کو سُکھ دے سکوں۔ میں نے ہی کوئی ایسی حرکت کی ہو گی جس کی بنیاد پر میرے

شوہر نے مجھے گھر سے باہر نکال دیا اور پھر طلاق کے کاغذات بھیج دیئے — لوگ کہتے ہیں ماں باپ سے زیادہ کوئی اپنا نہیں ہوتا لیکن میں نے دیکھا کہ ماں باپ بھی اپنے نہیں ہوتے۔ وہ بھی محبتوں کی تجارت کرتے ہیں۔ جس نے زیادہ دیا اُسی کے گُن گانے لگے۔ جس نے ہتھیلی بھری اُسی کے سر پہ ہاتھ پھیریں گے۔ کوئی بھی اپنا نہیں ہوتا۔ کیا وہ میرے اپنے تھے جنہوں نے مجھے قصوروار کہا اور گھر سے باہر نکال دیا —!

میں دو گھروں سے نکالی گئی تھی۔ زمانے کے مطابق تو وہ دونوں ہی میرے گھر تھے — لیکن دراصل میرا گھر کہیں نہیں تھا۔ میں ایسی بیوی، ایسی بہو اور ایسی بیٹی تھی جس کے لیے کسی بھی گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی — اتنے اچھے گھروں میں ایک کونہ بھی میرے لیے نہیں تھا۔ میں جو گھروں سے بے گھر کی گئی تھی میرے لیے کسی چھت کے پاس سہارا نہیں تھا۔ مجھے کوئی گھر پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ میں کسی اور کے گھر میں بھی کیسے رہ سکتی تھی؟

میں ان گھروں کے سحر اور کشش سے دُور اُس جگہ پہنچی جہاں میری طرح کی کئی اور لڑکیاں تھیں جنہیں وقت نے بے گھر کر دیا تھا — میں بھی اُن کے ساتھ ہوسٹل میں رہنے لگی۔ یہاں ملازمت پیشہ خواتین رہتی تھیں جو دن بھر دفتروں میں مصروف رہتیں اور شام یا پھر رات گئے ان یوسیدہ کمروں میں واپس لوٹ آتیں — کہ رات کو سونے کے لیے ایک بستر کی ضرورت بہر حال ہوتی ہے۔ تاکہ نیند آئے اور خواب دِکھائے — وہ خواب جو حقیقت کی تلخی سے سپنے کی شیرینی کا لُطف دے سکے۔ ہم سب ایک دوسرے سے دُکھ درد کہہ کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیتے — لیکن وقت نے مجھے جہاں اور بہت کچھ سکھایا وہاں یہ بھی میں نے سیکھا کہ کسی سے کچھ نہیں کہنا چاہیئے۔ لوگ راز چھپانا نہیں جانتے — کیونکہ وہ دوست نہیں ہوتے۔ جب کوئی آپ کے بارے میں بہت زیادہ جان لیتا ہے وہ دوسروں کی نسبت آپ کو زیادہ ایکسپلائٹ کرنے لگتا ہے۔ عورتیں کسی معمولی سی بات پر ناراض ہو کر ہزار لوگوں کے سامنے آپ کے راز فاش کرنے لگتی ہیں۔ وہ آپ کی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ

اٹھاتی ہیں۔ آپ اُن کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرتے ہیں۔ چونکہ آپ ان کے پھیلائے ہوئے جال سے واقف نہیں ہوتے اس لیے اُن کا شکار بن جاتے ہیں۔ میں خود مخلص تھی دیانتدار تھی۔ دوسروں کو اپنے جیسا خیال کرتی تھی مگر لوگ مجھ سے قطعی مختلف تھے۔ میں اپنی لاعلمی کی وجہ سے استعمال ہوتی رہی ــــ لوگوں پر اندھا اعتماد کرتی رہی ــــ اُن کا اصل جان کر حیران ہوتی رہی ــــ دھوکے کھاتی رہی۔ میرے اعتماد کو ٹھیس لگتی رہی لیکن میں خود کو نہ بدل سکی میں نے بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ خود کو کسی حد تک تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں میں نے ایک دن خود کو اس ہوسٹل کے دُکھوں سے آزاد کروایا اور یہ دو کمروں کا فلیٹ لے لیا ــــ پھر تم سے ملاقات ہوئی اور میں نے کہا کہ تم کہیں اور جانے کی بجائے میرے ساتھ رہو ــــ میرے پاس رہو ــــ فلیٹ ضرور چھوٹا ہے لیکن میرا دل میری تنہائی میری زندگی تمہارے آنے سے آباد ہو جائے گی۔ ہم دونوں مل کر زندگی کا مقابلہ کریں گے۔

تنویہ طویل سفر جو میں نے گھر سے نکل کر اس فلیٹ تک طے کیا ہے یہ سفر بہت کٹھن تھا ــــ راستہ بہت دشوار ــــ سفر میں تو سنگِ میل ہوتے ہیں، منزل نہیں ہوتی ــــ میں آج بھی اپنی منزل کی تلاش میں بھٹک رہی ہوں ــــ برسوں بھٹکتی رہی ہوں۔ اب میں نے اپنے گرد ایک حصار قائم کر لیا ہے۔ خود کو ان دیکھی دیواروں میں مقید کر لیا ہے کوئی بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ میرا حال کوئی نہیں جان سکتا۔ لیکن کوئی آواز ــــ کوئی لفظ۔ کوئی جملہ کبھی کبھی اس دیوار میں بھی دراڑ ڈال دیتا ہے۔ تب میں خوفزدہ ہو کر چیختی ہوں ــــ افسردہ ہوتی ہوں۔ اس لمحے پہ افسوس کرتی ہوں جب کوئی میری ذات کے گرد کھینچی دیوار پہ پتھر پھینکتا ہے۔ میری سوچ بھٹک جاتی ہے اور میں اپنے خیالات کے منتشر ہونے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتی۔ میں کسی کو اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اب میں جان گئی ہوں کہ میں کسی گھر کے لائق نہیں ہوں۔ میں تنہا ہوں، تنہا رہوں گی۔ میں نے خود کو اس تنہائی کا عادی بنایا ہے ــــ تم بھی تنہائی کم کرتی ہو۔ ختم نہیں کر سکتی۔ مجھے علم ہے کہ میں کبھی گھر

نہیں بنا سکتی۔ نہ ہی کسی اور کا گھر مجھے پناہ دے سکتا ہے۔ پناہ تو مضبوط سہارا دے سکتا ہے اور ہمارے گھر کچی مٹی سے بنائے جاتے ہیں۔ جس میں یقین نہیں ہوتا صرف اندازہ ہوتا ہے اور اندازے سے زندگی کو جیتا نہیں جا سکتا ــــ اندازے سے مکان اور نقشے بنائے جا سکتے ہیں ــــ گھر نہیں بنتے۔ گھر تو نصیبوں والوں کو ملتے ہیں۔ میں نصیبوں جلی ہوں۔ اس سمجھوتے پر جو آج میں نے کر رکھا ہے میں خوش نہیں ہوں۔ میرے لیکھ میں سُکھ نہیں ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں کہیں دُور چلی جاؤں ــــ شہر کے ہنگامے سے بہت دُور۔ جہاں کوئی اجنبی آواز نہ ہو ــــ کوئی درد نہ ہو ــــ کوئی اندھا خواب نہ ہو ــــ کوئی کام نہ ہو ــــ کچھ نہ ہو ــــ! اگر ہو تو سکون ہو ــــ اطمینان ہو ــــ خوشی ہو ــــ میری ذات کی دیوار میں کوئی دراڑ نہ پڑے۔ مجھے دراڑوں سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے دیواروں کی بُلندی سے خوف آتا ہے۔ لگتا ہے جیسے ان میں میرا دم گھٹ رہا ہو۔ میری جان نکل رہی ہو ــــ کوئی بھی ان دیواروں سے مجھے کیسے جان سکتا ہے؟ کسی کو بھی میرے بارے میں کیسے علم ہو سکتا ہے؟ کوئی بھی شخص میرے اتنے قریب کیسے آ سکتا ہے کہ میرے دِل میں جھانک سکے۔ میری روح کے درد جان سکے ــــ مجھے کوئی بھی نہیں سمجھتا ــــ نہیں جانتا ــــ نہ میرے ساتھی ــــ نہ میرے دوست ــــ کسی نے مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ نہ میرے والدین نے ــــ نہ ہی شوہر نے اور نہ سُسرال والوں نے ــــ صرف تم ہو جو مجھے سمجھتی ہو ــــ مجھے جانتی ہو ــــ میرے ساتھ رہتی ہو ــــ میرے پاس رہتی ہو۔ ورنہ اب سے پہلے اور کون تھا؟ تمہیں ہو جس نے مجھے زندہ رکھنے کی کوشش کی ــــ مجھے اس دنیا میں لانے کا ایک نیا انداز سکھایا۔ تم نے مجھ میں زندہ رہنے کی ایک امنگ پیدا کی ــــ ایک اُمید ایک خواہش میرے دل میں بیدار کی ورنہ میں تو جانے کب کی مر گئی ہوتی ــــ مجھے اُمید دلا کر تم خود نا اُمید ہو رہی ہو ــــ یہ کیسے ممکن ہے ــــ دوسروں کو زندگی دینے والا خود زندگی سے دُور کیسے جا سکتا ہے؟ اگر تم نہ رہو گی تو میں بھی نہیں رہ سکوں گی ــــ میرے لیے تمہارا ہونا بہت ضروری ہے۔ تمہی نے تو مجھے بتایا کہ میرا وجود بھی اہم ہے ــــ آج میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ تمہارا وجود بھی اہم ہے۔

تمہارے ہی بتلائے ہوئے راستے تمہیں دِکھا رہی ہوں۔ ہم اب تک ساتھ چلے ہیں۔ آئندہ بھی ساتھ ہی چلیں گے — ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن چکے ہیں۔ ہمیں ضرورت بن کر ہی جینا چاہیئے میں زندہ رہنا چاہتی ہوں اور تمہیں بھی اس وقت تک جینا ہوگا جب تک میں ہوں۔ میں اپنی زندگی میں اب اور کچھ نہیں سہہ سکتی — میں تم سے جدائی کا صدمہ نہیں سہہ سکتی — میں اتنی بہادر نہیں ہوں — اب میں کسی بھی پیارے سے دُوری کا دُکھ برداشت نہیں کر سکتی — یہ میری مجبوری ہے — تمہارا پیار تمہاری دوستی میری مجبوری بھی ہے اور ضرورت بھی — تم ہی میری دوست ہو — مجھے کتنی عزیز ہو — یہ بتانا ضروری نہیں ہے — جن باتوں کا علم ہو اُن کا دُھرانا ضروری نہیں ہوتا — مجھے بھی تمہیں اور کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ میری طرح تمہیں بھی رہنا چاہیئے — ہمیں رہنا چاہیئے — !

ہاں — ہمیں ابھی رہنا چاہیئے !

۲

سیمیں ! تمہاری طرح میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں کہیں دُور چلی جاؤں — بہت ہی دُور — جہاں کوئی مجھے نہ جانتا ہو — نہ کوئی پہچانتا ہو۔ میں شہرت سے تھک گئی ہوں۔ شناخت سے ڈر گئی ہوں۔ کسی ایسی گمنام جگہ پہ رہنا چاہتی ہوں۔ جہاں میری ذاتی زندگی میں کوئی مداخلت کرنے والا نہ ہو — لیکن یہ بھی ویسی ہی خواہش ہے جیسی تم کر رہی ہو۔ تم ٹھیک کہتی ہو یہ بھی ایک خواب ہی ہے۔ اندھا خواب جو کوئی تعبیر دے گا۔ ہے نا ؟

تنو ! جس شعبے سے تعلق رکھتی ہو۔ وہاں یہ ممکن نہیں ہے۔ تم خود ہی اپنی پہچان کرواؤ گی۔ اداکاری چھوڑنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ تم پھر کسی نہ کسی ٹی وی سنٹر سے ڈرامہ کرتی نظر آؤ گی۔ تم خود اپنی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہو۔ خود کو کیسے روک سکو گی ؟ یہ دیوار کیسے ہٹاؤ گی۔ اداکاری تو تمہاری ذات کا ایک بہت اہم حصہ ہے۔ یہ دیوار نہ تم گرا سکتی ہو اور نہ ہی اسے پھلانگ سکتی ہو — بنیادی طور پہ تمہارا ایسی خواہش کرنا ہی غلط ہے۔

آخر میری ہی خواہش غلط کیوں ؟

تنو ! تم اکیلی تو نہیں ہو — تمہارے ساتھ میں بھی ہوں — تمہاری طرح غلط خواہشات کرنے والی بھی اور غلط فیصلے کرنے والی بھی — زندگی میں ہمیشہ کردار ادا کرنے والی — ایک ایسا کردار جسے ہم خود اچھی طرح سے ادا نہیں کر پاتے — کوشش ضرور کرتے ہیں — تم اسکرین پر اداکاری کرتی ہو اور پس اسکرین سے باہر زندگی میں اداکاری کرتی ہوں۔ تمہاری اداکاری

نظر آجاتی ہے اور میری اداکاری اتنی حقیقی اور فطرت کے قریب ہوتی ہے کہ کوئی بھی نہیں جان پاتا۔ تم لوگوں کو تو اداکاری کا صلہ ایوارڈ کی صورت میں مل جاتا ہے اور عام لوگ جو ہر مقام پر خواص سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں — ہم اس میں بھی تم سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہماری حیثیت کسی ہارے ہوئے کھلاڑی جیسی ہوتی ہے — اور کسی ایک کھیل میں نہیں ہم ہر کھیل میں ہار جاتے ہیں۔ اور کھیل تو چھوڑو — ہم تو زندگی میں ہر لمحے ہار جاتے ہیں — بلکہ ہارتے ہی چلے جاتے ہیں — یہی ہماری قسمت ہے —!

ہاں سیمیں — میں بھی انہی لوگوں میں شامل ہوں جو قسمت کے ہاتھوں ہار جاتے ہیں۔ میں اسکرین پر اداکاری کرتی ہوں۔ اس لیے نہیں کہ مجھے کوئی ایوارڈ ملے۔ ہر اداکار ایوارڈ کے لالچ میں نہیں ہوتا۔

تنّو! یہ حیلہ پبلک کے لیے تو ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے نہیں۔ تم اپنے اندر جھانک کر دیکھو۔ کیا کہیں صلے کی کوئی خواہش تو نہیں دبی ہوئی۔ کوئی چنگاری جو کسی بھی لمحے بھڑک کر شعلہ بننا چاہے گی — تمہیں اِن معاملات میں بھی سچ بولنا چاہیئے۔ شائد کبھی خود سے یا کسی اور سے سچ بولنے کی ضرورت پڑ جائے۔ اسکرین پر اور اسکرین سے باہر بھی تم جھوٹی زندگی ہی گزارتی ہو۔ جھوٹی ہنسی، جھوٹی مسکراہٹ، کیا تم اس جعلی مسکراہٹ سے تھک نہیں جاتیں — تم بھی پاگل ہی ہو۔ اسی لیے تو دوسرے فنکاروں کی طرح گلیسرین استعمال کرنے کی بجائے حقیقت میں رونے لگتی ہو اور پھر تمہارے آنسو ہیں کہ بہتے ہی چلے جاتے ہیں۔ شائد جو اپنے باہر بہت زیادہ روتے ہیں وہ اپنے اندر کم روتے ہوں گے۔ تم بھی اتنا روتی ہو کہ تمہیں خاموش کروانا مشکل ہو جاتا ہے۔ بہت جذباتی ہو اسی لیے ہر قدم پر حادثے تمہارے منتظر رہتے ہیں۔ پھر وقت کے ساتھ تم نے بہادر بننے کی اداکاری شروع کر دی اور آہستہ آہستہ بہادر بنتی چلی گئیں۔ لیکن تم میں پوشیدہ اصل تہمینہ تو آج بھی پہلے دن جیسی بزدل ہے۔ اگر تم بزدل نہ ہوتیں تو ہر دوسرے روز خود پر زندگی کے، روشنی کے، آواز کے دروازے بند نہ کرتیں۔ تنہا رہنے پر ہی اصرار نہ کرتیں۔ آخر تمہیں کس نے

کہا تھا کہ تم حد درجہ حساس بنو۔ ہر بات شدّت سے محسوس کرو۔ لوگوں کے ہر عمل پہ تمہارا شدید قسم کا ردِ عمل ہو۔ یہی REACTION تمہیں اکثر اخباروں کی سُرخی بنا دیتا ہے اور تم اپنی حماقت سے اس پر اظہار کرتے ہوئے ان اخبار نویسوں، ان صحافیوں کو ایک اور شہہ سرخی خود مہیا کرتی ہو۔ انجانے میں تم بات بنانے کی بجائے بگاڑ دیتی ہو۔ تمہارا بنا بنایا امیج تمہارے ہی ہاتھوں تباہ ہو جاتا ہے اور تم — شدید سر درد کی اذیت سہنے لگتی ہو۔ ہمیشہ یہی خطرہ رہتا ہے کہ کہیں تم اس تکلیف کی وجہ سے کمٹی ن برین ہیمبرج کا شکار نہ ہو جاؤ۔ تم مسلسل اعصابی دباؤ کی مریضہ ہو گئی ہو۔ اب تمہیں سکون بخش ادویات بھی آرام نہیں پہنچاتیں۔ تمہارے اعصاب بُری طرح کمزور ہو چکے ہیں۔ تم خود کو سنبھال نہیں سکتیں — تم بہادر بننے کی اداکاری کرتے ہوئے بھی بزدل ہی رہتی ہو۔ تم خود جانتی ہو کہ تم کسقدر بُری فارمنس دے رہی ہو — لیکن تم بے بس ہو — بے اختیار ہو — افسوس تم کچھ بھی نہیں۔

تنّو! اگر تم ایسی نہ ہوتیں تو خوب مزے میں ہوتیں، عیش کرتیں مگر عیش تمہارے نصیب میں کہاں ہے کیسے اچھے اچھے لوگوں کو تم نے کتنی آسانی سے ٹھکرا دیا۔ کتنی بددعائیں لیں۔ اگر کسی نے قبول کیا ہوتا تو آج تم تنہا نہ ہوتیں۔ لیکن تم تو شائد عشق کی مثال قائم کرنے چلی ہو۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو آج تک وقار کا انتظار نہ کرتیں — اب وہ کیا واپس لوٹے گا۔ فرض کرو اگر آج وہ لوٹ بھی آئے تو جانے کس حال میں ہو — کس طرح آئے —؟ تم تو بس یونہی سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ وقار کو آنا ہوتا تو برسوں پہلے آجاتا۔ یا پھر باہر نہیں جاتا۔ اُسے تو یہ علم نہ ہو گا کہ تم ٹیلیویژن کی صفِ اوّل کی اداکارہ مانی جاتی ہو۔ لوگ ٹیلیپ پہ تمہارا نام پڑھ کر ہی ڈرامہ دیکھتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اگر اداکاری سیکھنا ہو تو تہمینہ حسن سے سیکھے۔ تہمینہ سے اچھی اداکاری کوئی نہیں کرنا جانتا۔ لیکن آخر کب تک؟ تم کب تک خود کو دھوکہ دیتی رہی گی۔ ڈرامے کرتی رہو گی۔ کسی کو بھی معلوم نہیں کہ کسی کھیل میں جذباتی اداکاری کرنے کے بعد تمہاری کیا حالت ہوتی ہے؟ ڈرامے کے سیٹ پر تو تم صرف آنسو بہاتی ہو۔ گھر آنے پر تم کس بُری طرح چیختی چلاتی ہو۔ تمہاری ذات کی شکست و

سخت کوئی بھی نہیں دیکھتا۔ کئی دِنوں تک تم بستر پہ پڑی رہتی ہو — خود سے بھی خوفزدہ رہتی ہو۔ کسی ہلکی سی آواز سے بھی چونک جاتی ہو۔ کبھی بہت زیادہ شور بھی تمہیں سنائی نہیں دیتا تم بکھر جاتی ہو اتنی کہ تم خود کو بھی سنبھال نہیں سکتیں — میں تمہیں سنبھالتے سنبھالتے خود بیحال ہو جاتی ہوں۔

پہلے تم ایسی نہیں تھیں — اب تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ اکثر تم لوگوں کی باتوں پر جھنجھلا جاتی ہو۔ لوگوں سے ملنے سے گریز کرتی ہو۔ انٹرویو لینے والوں سے تمہارا رویّہ نامناسب ہوتا ہے۔

کبھی طبیعت کا بہانہ، کبھی موجود ہوتے ہوئے بھی نہ ہونے کا جھوٹ بولتی ہو۔ اب مجھ سے کچھ اور برداشت نہیں ہوتا۔ تم خود کو سنبھالو، کچھ دنوں کے لیے جگہ تبدیل کر لیتے ہیں۔ اس ماحول سے ہٹ کر دیکھتے ہیں — شاید یہ تبدیلی ہمیں راس آئے۔ آؤ کچھ روز کے لیے کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ میں بھی دفتر سے چھٹی کر لیتی ہوں۔ دفتر والے حیران پریشان ہو جائیں گے پہلی مرتبہ میں چھٹی لوں گی، ورنہ اتنے برسوں میں نے کبھی بھی چھٹی نہیں کی — چاہے موسم کیسا بھی ہو۔ چاہے کیسی ہی مجبوری ہو — میں نے ایک دِن کی بھی چھٹی نہیں لی — وہ سب بہت حیرت زدہ ہونگے۔ ہم شہر سے کہیں دُور چلے جائیں گے۔ منافق اور جھوٹے لوگوں کی دُنیا سے دُور، ان رنگوں، لفظوں کی دنیا سے دُور، گلیمر کی چکا چوند سے پرے، فیشن گن کی چمک سے نکل کر۔ بہت سے چہروں سے بچ کر کسی پرسکون گوشے میں کچھ دن گزارتے ہیں۔ اپنے ساتھ بھی رہ کر دیکھیں۔ خود کو جانیں۔ اپنے آپ کو سمجھیں۔ ہم اکثر خود کو بھول کر خود کو نظر انداز کر کے جیتے ہیں۔ کبھی تو خود کو بھی کچھ اہمیت دیں۔ تم بھی بھی چلو گی نا — ؟ ہم دونوں چلیں گے۔ اچھا تجربہ رہے گا۔ ہمیں کچھ روز کے لیے اس ماحول سے نکل جانا چاہیئے — ہم جائیں گے نا ؟

نہیں — سمیں ہو سکتا ہے میرے جانے کے بعد وہ آ جائے۔ ممکن ہے کہ ....؟

تنّو! تم ایک نہ آنے والے شخص کا برسوں سے انتظار کر رہی ہو۔ وہ اب نہیں آئے گا۔

مجھے یقین ہے — وہ ضرور آئے گا۔ اُسے آنا ہی ہوگا۔ ابھی نہیں تو کبھی ضرور!

تنّو! میں اس وقت سے ڈرتی ہوں جب تمہارا یقین ٹوٹے گا۔ تب کیا ہوگا؟

تم ایسی بات مت کہو۔ ایسا سوچنا بھی نہیں۔

تم ایک جھوٹی آس پہ کب تک جیو گی۔ آخر ایک دن تو .....؟

سمیں! تمہیں علم ہے کہ جینے کے لیے آس، اُمید کتنی ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان مر جائے۔

تنّو! میں تمہیں زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ اسی لیے کہتی ہوں تم جھوٹ کی زندگی نہ گزارو۔ وقت اب کہاں آئے گا؟ کبھی کبھی کچھ پنچھی اور پردیسی لوٹ کر نہیں آتے — وہ واپسی کا سفر بھول جاتے ہیں۔ وقار آنے کے لیے نہیں گیا وہ تو صرف جانے کے لیے گیا ہے۔ ممکن ہے اُسے تمہاری چاہت کا اندازہ ہی نہ ہو اور تم برسوں سے چپ چاپ انتظار کی اذیّت کیسے گوارا رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے تمہارا نام کھرچ کر پھینک چکا ہو۔ اب تمہاری یاد بھی اُس کی مجبوری نہ رہی ہو۔ مرد عورت کو جس آسانی سے ضرورت بنا لیتا ہے اُسی آسانی سے اس کی یہ ضرورت ختم بھی ہو جاتی ہے۔ وہ جس شدّت سے عورت کو یاد کرتا ہے اُسی شدت اور تیزی سے اسے بھول بھی جاتا ہے۔ عورت تو احمق ہوتی ہے۔ بھولی بھالی سیدھی سادھی ہوتی ہے۔ پھر بھی اُسی کا نام لیے چلی جاتی ہے۔ ہر پل اس کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ اس کی آرزو کرتی ہے۔ اُسے آنکھوں میں بسا کے دل میں چھپا لیتی ہے۔ وہ اس کی خاطر خود کو بھی بھول جاتی ہے۔ مرد تو اُس کے احسانات، اس کا ایثار، اُس کی محبّت سبھی کچھ بھول جاتا ہے۔ صرف چند لمحوں کے لیے یاد کرتا ہے جب بھی کوئی مشکل پیش آئے۔ تب اس کے بغیر کوئی آسرا دینے والا نہ ہو۔ کوئی بھی ہمت بندھانے والا نہ ہو۔ جس وقت اُس کی ضرورت ہو۔ ورنہ مرد عورت کو اتنی اہمیت کب دیتا ہے؟ جب کہ عورت کے لیے مرد ہی اہم ہوتا ہے۔ وہی طور ہوتا ہے۔ وہی کل کائنات

ہوتا ہے۔ جب کہ مرد کے لیے کائنات میں کئی اور چیزیں بھی پرکشش ہوتی ہیں۔ اُس کے لیے اپنے کام، اپنے تعلقات اور کئی دوسری اشیاء اہم ہوتی ہیں ـــ بہت سی چیزیں بہتر لگتی ہیں۔ عورت تو ثانوی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ بعض حالات میں بعض لوگوں کے نزدیک تو کوئی حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ میں نے تو یہی دیکھا اور جانا ہے۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ یہی کہتا ہے۔ لیکن تم مجھ سے کہیں زیادہ علم رکھتی ہو ـــ وسیع تجربہ رکھتی۔ تم مجھ سے اختلاف بھی کر سکتی ہو اور اتفاق بھی کیونکہ دُنیا ہو نہ ہو میں آزادی رائے کے حق میں ہوں ـــ ہر شخص اپنے تجربات کی روشنی میں کسی نہ کسی بات کے بارے میں کچھ کہتا ہے اور ہر شخص اپنی جگہ سچّا ہوتا ہے یہ میرا یقین ہے ـــ میں اسی بات کو مانتی ہوں۔

سیمیں! عورت کم حیثیت ہو کر تو جی سکتی ہے مگر بے حیثیت ہو کر نہ جی سکتی ہے اور نہ ہی مر سکتی ہے وہ مجھے نہیں بھولا ہوگا۔ اس کے اندر کبھی نہ کبھی میری آواز میری ضرورت پکارتی ہوگی۔ کسی نہ کسی پل اُسے یہ احساس شدّت سے ہوتا ہوگا کہ میں موجود ہوں۔ میں اس میں ضرور زندہ ہوں گی۔ وہ میرے لیے ضرور واپس آئے گا۔ میں اس وقت کے انتظار میں بیٹھی ہوں جب وہ میری خاطر آئے گا۔ صرف اور صرف میرے لیے آئے گا۔ اگر وقار نہ ہوتا، اس کا درد نہ ہوتا، خواہش نہ ہوتی، تڑپ نہ ہوتی، انتظار نہ ہوتا۔ آج میں تہمینہ حسن کے نام سے زندہ نہ ہوتی۔ میرا وہ حصّہ نہ ہوتا جسے لوگ فنکار کہتے اور مانتے ہیں۔ آج میرے سینے میں درد نہ ہوتا۔ دُکھ کی وہ لہر نہ ہوتی جو لوگوں کے دِلوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ لوگ میرے سچ مچ رو دینے پر بہت حیران ہوتے ہیں۔ لوگ کب جانتے ہیں کہ مجھ میں کتنے درد سانس لیتے ہیں۔

میرے اندر اتنا دُکھ ہے کہ عمر بھر آنسوؤں میں بہاتی رہوں تب بھی ختم نہ ہو۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ صرف وقار ہی کا دکھ ہے۔ لاکھوں اور دُکھ بھی تو ہیں۔ میں اس زندگی کو اپنے بدن پر جھیلا ہے۔ اپنے ہاتھوں برتا ہے۔ میں نے جتنے بھی کردار ادا کیے وہ سب میرے حصّے ہیں۔ وہ بھی مجھ میں زندہ ہیں۔ حساس ہوں اسی لیے سب کے دُکھ، تکلیفیں اپنی روح میں محسوس کرتی ہوں۔ میں اپنے اندر ہر گھڑی کسی دوسرے کے دُکھ پہ مرتی رہتی ہوں اور ان سب میں کوئی بھی نہیں، کوئی ایک شخص بھی نہیں جو میری اس موت سے واقف ہوتا۔ سبھی انجان ہیں۔ سبھی اجنبی ہیں۔ میں ان اجنبی لوگوں میں کسی اپنے کے لیے ترس رہی ہوں۔ تڑپ رہی ہوں۔ کسی بہت اپنے کی ضرورت محسوس کرتی ہوں ـــ جو میرا ہو ـــ میرے لیے ہو۔

تو اگر تم سچ کہہ رہی ہو تو کیا تم ان آنکھوں کے آنسو نہیں دیکھتیں جو لوگ تمہاری خواہش میں زندہ رہتے ہیں۔ تم انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتیں۔ وقعت نہیں دیتیں۔ کیوں؟ اگر اس طرح کوئی ایک شخص بھی میری خاطر آتا تو میں کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی اس کے ساتھ چل پڑتی۔ تم کس طرح، کس آسانی سے خود سے دُوری کا حکم دے دیتی ہو؟ اچانک کیسے تم اُن کو خود سے جُدا کر لیتی ہو؟

سیمیں ـــ تم جانتی ہو ـــ میں تو کسی معمولی درد کو بھی بہت شدّت سے محسوس کرتی ہوں۔ لیکن جس کے انتظار میں میں نے اپنی عمر کا ایک حصّہ گزار دیا۔ مجھے اپنا غم اپنا درد ان سب لوگوں کے درد سے کہیں زیادہ لگتا ہے۔ مجھے یہ درد بہت عزیز ہے۔ میں خود غرض ہو جاتی ہوں اسی لیے سب کو بھول کر، نظر انداز کر کے میں اپنے آپ میں چھپ جاتی ہوں۔ مجھ سے زیادہ تنہا کون ہوگا؟ مجھ سے زیادہ تنہائی کا زہر کس نے

پیا ہوگا ؟ رتجگے کس کی آنکھوں نے کاٹے ہوں گے ۔ مجھ سے زیادہ کوئی بھی اہم نہیں ہے ۔ جن لوگوں کی تم بات کرتی ہو یہ صرف عشق کو بدنام کرتے ہیں ۔

ان میں کون ہے جو عشق کی روح سے واقف ہو — یہ تمام لوگ خود غرض ہیں ۔ سب اپنے لیے آتے ہیں ۔ میری ذات کے لیے تو کوئی بھی نہیں آتا ۔ سب کو میرا نام ، میری شہرت ، میرا ظاہری حسن چاہیئے ۔ ایک عورت چاہیئے — ایک جسم ، ایک کھلونا — اور بس — !

میری ذات کے لیے تو کوئی بھی نہیں آتا ۔ مجھ اکیلی کو کوئی بھی نہیں چاہتا ۔ کوئی نہیں جانتا ۔ مجھے بحیثیت انسان کے نہ کوئی سمجھتا ہے ، نہ چاہتا ہے ۔ میری کوئی ضرورت ہی نہیں ہے ۔ اگر کسی کو ضرورت ہے تو میرے نام کی — ہر شخص کو ایک ملازمہ چاہیئے ۔ جو گھر میں بھی کام کرے اور باہر بھی ۔ کہیں بھی کام کرے اس کی حیثیت ملازم کی ہی ہوگی ۔ ان سب لوگوں کو نمبینہ حسن کی ضرورت ہے ۔ تمہاری تنو کی نہ کسی کو خواہش ہے اور نہ ضرورت ۔ اگر کوئی کچھ چاہتا ہے تو صرف یہ کہ میں ہمیشہ کام کرتی رہوں ۔ نام کماتی رہوں ۔ اپنا آپ بیچتی رہوں خود کو کیش کرتی رہوں ۔ لوگ مجھے کیش کر سکیں — یہی حقیقت ہے باقی سب جھوٹ ، لفظوں کے ہیر پھیر سے مفہوم نہیں بدل جاتے ۔ آنکھوں کی بھوک نہیں چھپتی وہ بہرحال نظر آتی ہے ۔ اسی بھوک سے مجھے شدید نفرت ہے ۔ انسان کتنا بھوکا پیاسا ہے اس کا اندازہ تمہیں بھی ہے ۔ بس انداز بدل جاتے ہیں ۔ لہجے اور آوازیں مختلف ہوتی ہیں مگر سب کا مقصد ایک ہی ہے ۔ ایک ہی رہتا ہے ، کل بھی ، آج بھی ، ہمیشہ — !

تنو — ممکن ہے تم کسی سطح پہ غلط کہہ رہی ہو ۔ ہو سکتا ہے انہی لوگوں میں سے کچھ یا کوئی ایک ایسا بھی ہو جو صرف تمہیں چاہتا ہو ۔ تم سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہو ۔ ایک سا سمجھتی ہو جب کہ ہر شخص انفرادی حیثیت کا حامل ہے تم جزو کو کل سمجھتی ہو ۔ ہر شخص ایک ہی مقصد

لیے ہوئے نہیں آتا — سوچو تو سہی — غور کرو ۔ ہو سکتا ہے ان میں کوئی سچا ہو ۔ سب لوگ تو پرائے نہیں ہوتے ۔ کوئی اپنا بھی تو ہو سکتا ہے ۔ کوئی ایسا شخص جسے تم سے محبت ہو ۔ جسے تمہاری ضرورت ہو ۔ جو تمہاری خواہش رکھتا ہو ۔ جو تمہی کو چاہتا ہو ۔

سیمیں — ہو سکتا ہے — مگر ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے ۔ کوئی شخص اپنا نہیں ہے ۔ بس ان سب سے الگ وہی ایک اپنا ہے جس کی میں منتظر ہوں ۔ وہ ایک دن ضرور آئے گا ۔ میرا دل گواہی دیتا ہے ۔ وقار کبھی ضرور آئے گا ۔

تنو ! دل کی گواہی سچی ہوتی ہے مانتی ہوں لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ یہ گواہی سچی ہو ۔ وقار نہیں اس لیے اپنا لگتا ہے کہ وہ تمہاری زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہمیشہ زندہ رہ پایا کرتا ہے ۔ چاہے وہ شخص جھوٹا بھی ہو ۔ دل اُسے جھوٹا نہیں مانتا ۔ اُس کے منافق ہوتے ہوئے بھی اُسے منافق ماننے کو جی نہیں چاہتا ۔ پہلا مرد خوابوں کی تعبیر کی صورت چونکہ تصور سے تصویر بن کر سامنے آتا ہے اس لیے بہت اہم ہوتا ہے ۔ دل اور دماغ میں اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے ۔ اس کے بعد ہزاروں ، لاکھوں لوگ آئیں — وہ سب نظر کو جچتے نہیں ۔ دل کو بھاتے نہیں ۔ پہلا خواب ، پہلا مرد پہلا پیار کبھی نہیں مرتا ۔

سیمیں ! میں ان سب باتوں کو نہیں جانتی ۔ میں کچھ نہیں سوچتی — میں کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتی ۔ اگر وقار جھوٹا اور منافق بھی ہے تب بھی میرے لیے صرف اور صرف وقار ہے اور کوئی بھی نہیں — وقار کی جگہ نہ کوئی لے سکا ہے اور نہ ہی لے سکے گا ۔ میرے لیے وقار کے علاوہ کوئی نہیں ۔ آج بھی نہیں — کبھی نہیں — !

وقار کی جگہ اگر کوئی نہیں لے سکا تو اس لیے کہ ہر شخص کی اپنی جگہ اپنا مقام ہوتا ہے۔ کوئی کسی کی جگہ نہ لے سکا ہے، نہ لے سکتا ہے۔ لیکن ممکن ہے کوئی ایسا آئے جو وقار سے زیادہ پرکشش ہو — جو اُس سے آگے نکل جائے۔ اس کا نقش بھی مٹا ڈالے — لیکن وہ کون ہوگا اور کب آئے گا — یہ ہم نہیں جانتے —

میں کچھ جاننا بھی نہیں چاہتی — میں کسی کو موقع دوں گی تو وقار سے آگے نکلے گا — میں نہیں چاہتی کوئی وقار سے مجھے چھین لے جائے۔ کوئی اس کا نقش مٹائے — ہاں وقار اگر خود یہ کوشش کرے تو دوسری بات ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ ایسا کبھی ہو — ایسا ہونا نہیں چاہیئے۔

تنو! اکثر انہونی ہونی بن جاتی ہے، اور ہونی کو انہونی کی سزا ملتی ہے — وقت جانے کب کیا کر جائے؟ دُعا تو یہی ہے کہ تمہارے ساتھ کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ تم اب وقت کا کوئی اور ستم نہیں سہہ سکتیں — کوئی بھی حادثہ اب تمہارے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی اور غم برداشت کرنا پڑے — میں نہیں چاہتی کہ وقار کی بے وفائی کا سانحہ تم پر گزرے۔ اور تم زندگی سے دُور ہو جاؤ — موت کی سرحد تک تمہیں جانے کی اجازت میں نہیں دوں گی۔ تمہیں خودکشی کا راستہ میں نہیں اپنانے دوں گی — تمہیں زندہ رہنا ہوگا۔

۳

ایک طویل وقفے کے بعد

تہمینہ کیا واقعی وقار آیا ہے —؟

ہاں — وہ آگیا ہے۔

کیا تم ملی ہو —؟

ہوں — ملی تھی۔

کیسا ہے وہ —؟

تقریباً ویسا ہی — وقت نے تھوڑا بوڑھا ضرور کر دیا ہے۔

کیا سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا کہ پہلے تھا —؟

سبھی کچھ چیزیں تبدیلی ہو ہی جاتی ہیں۔ کچھ تبدیلیاں تو حالات پیدا کرتے ہیں اور کچھ بس ہونا ہوتی ہے۔ اس لیے ہو جاتی ہیں۔

کیا اسے معلوم تھا کہ تم اُس کی منتظر تھیں؟

ہاں — اُسے یقین تھا کہ کوئی اور کرے نہ کرے میں اُس کا انتظار کر رہی ہوں گی۔

پھر اتنی دیر کیوں لگائی؟

بس — وقت بہت کچھ چھین لیتا ہے۔ کبھی قربتیں فاصلوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ کچھ فاصلے قربتوں میں بدل جاتے ہیں۔ وقت بہت ظالم شے ہے، بہت ہی ظالم!

ہاں — میں جانتی ہوں — کیا اُسے یہ علم تھا کہ تم ٹی وی — ؟

ہاں اسے پتہ تھا کہ کل کی تھمینہ جو ایک آفس سیکرٹری تھی آج اُسے وقت نے ایک معروف ٹی وی اداکارہ بنا دیا ہے۔ میری دوست نورین یہاں سے میرے ڈراموں کے کیسٹ وہاں لے جاتی رہی۔ اس کی وجہ سے وقار نے بھی میرے کچھ ڈرامے دیکھ لیئے۔

وہی نورین — ؟

ہاں وہی نورین — وقار کی سابقہ بیوی۔ وقار سے میری نسبت بچپن میں طے ہو گئی تھی — مجھے نہیں پتہ تھا کہ میرے ساتھ ہی ساتھ میری بچپن کی سہیلی نورین بھی اسے چاہتی ہے۔ لیکن وقار یہ بات جانتا تھا۔ شادی سے پہلے پڑھنے کے لیے وہ باہر چلا گیا — وہ نورین سے بھاگا تھا پھر وہی اس کے پاؤں کی زنجیر بن گئی۔ دراصل انسان بھاگتا کسی اور سے ہے اور دُور کسی اور سے ہو جاتا ہے۔ کرنا کچھ چاہتا ہے — ہو کچھ جاتا ہے۔ نورین وقار کے پیچھے کینیڈا تک چلی گئی — اور بالآخر اُسے نورین سے شادی کرنا پڑی۔

تنو! کہیں ایسا تو نہیں کہ اُن دونوں نے تمہیں یہ بیان دیا ہو جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہو؟

سیمیں! میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتی — لیکن مجھے یہ تمام معلومات وقار نے بہم پہنچائیں۔ اُسی نے مجھے یہ بتایا کہ نورین کو وہاں کی روشنیاں اپنے ساتھ بہا لے گئیں۔ آزادی کی خواہش میں وہ اس رشتے کی زنجیر توڑ کر وقار سے آزاد ہو گئی۔ نورین نے بہت سے دوست بنائے جن سے اُس کے گہرے تعلقات قائم ہوتے چلے گئے۔ وہاں کی دلکشی نے اُسے اپنا اسیر بنا لیا۔ وہ اب وقار کی بیوی نہیں لیکن بہت سے مرد اس کے

شوہر ہونے کے دعویدار ہیں۔ وہاں شوہر اور بیوی کے رشتے کے لیے کاغذ پہ دستخط کرنا ضروری نہیں سمجھے جاتے۔ زبانی کلامی کئی معاہدے کئے جاتے ہیں اور یوں لوگ ایک ساتھ دُور جا چکی ہے۔

اب وقار تم سے کیا چاہتا ہے؟

وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ اگر وہ میرا ہی تھا تو اتنا عرصہ میں نے عذاب کیوں سہا — ؟ اتنے برس اُسکے انتظار میں گزار دیئے۔ اب وہ اپنی بیٹی شیریں کو لے کر اچانک آ پہنچا ہے۔ تم مشورہ دو — میں کیا فیصلہ کروں؟ اگر وقار کی بات مانوں تو شیریں کی ذمہ داری بھی مجھے اٹھانا پڑتی ہے۔ میں تو خود تہی دامن ہوں اُسے کیا دوں گی؟ اب میں عُمر کے اس حصے میں ہوں۔ جہاں مجھے خود کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ میں بھی سہارا چاہتی ہوں — اب میرے لیے سہارا بننا مشکل ہے۔ میں تو خود اپنا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہوں میں اس کا بوجھ کیسے بٹاؤں گی — ؟ مجھے کیا کرنا چاہیئے — ؟ میں کیا کروں — تم ہی کچھ بتاؤ ناں — ؟

تنو! وقار تمہارے پاس ایک آس، ایک اُمید لے کر آیا ہے۔ لیکن میری دوست ایثار اور قربانی ٹیلیویژن کے ڈراموں میں دینا تو آسان ہے مگر حقیقی زندگی میں بہت مشکل۔ وقار نے اگر نورین کو بھرپور توجہ اور محبت دی ہوتی تو وہ کبھی نہ بھٹکتی۔ اُس نے اُسے بھٹکنے کی مہلت ہی کیوں دی؟

وقار نے نورین کے مرد دوستوں کا ذکر جس انداز سے کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی کامپلیکس کا شکار ہے اور اس سے اُس کے شکی مزاج ہونے کا احساس ہوتا ہے — اُسے خود پر اعتماد نہیں اسی لیے اس نے نورین پر اور اس کے جاننے والوں پر شک و شبہ کیا۔

اُس نے نورین کو اعتماد نہیں دیا — اور شادی اگر اُس نے کسی دباؤ کی وجہ سے بھی کی تھی تب بھی شادی کے بعد نورین کے سُکھ دینا اُس کا فرض تھا۔ اُس نے نورین کو رنگینیوں، رنگوں کی دُنیا میں اس ریلے میں بہہ جانے کا موقع کیوں دیا — ؟ اُسے بحیثیت ایک بیوی اور بحیثیت ماں کے اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیوں نہیں کیا ؟ اسے دور کیوں جانے دیا — اُسے واپس لانے کی کوشش کیوں نہیں کی — ؟

وقار نے کوشش کی — لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ عجیب بات ہے جو عورت اتنی دور اس شخص کے پیچھے جا سکتی ہے وہ اس طرح اُسے چھوڑ سکتی ہے۔ نورین کے اس فیصلے کو میں بھی نہیں سمجھ پائی — مجھے بھی حیرت ہوئی۔ جب اُس نے عمر بھر وقار کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا پھر اس طرح جدائی۔ بچی کو نظر انداز کیسے کر دیا — کیسے وہ اپنی جنّت سے نکل گئی — میں نہیں جان سکی۔

اس سلسلے میں تم بھی میری طرح حیران اور پریشان ہو — دیکھو! ایک طرف تو وہ اسقدر وقار کو چاہتی ہے اور دوسری طرف وقار اور شیری کو چھوڑ جاتی ہے — یہ تضاد کیوں ہے ؟ ضرور کوئی اور بات ہوگی۔ ضروری نہیں کہ جو وقار تمہارے سامنے ہے وہی اس کا اصل ہو — وہ ویسا ہی ہو جیسا کہ نظر آتا ہے۔ تم سوچو — یہ عمر بھر کا سودا ہے۔ چند لمحوں، چند گھنٹوں یا کچھ دنوں کی بات نہیں۔ تمہیں وقار کی بیوی اور شیریں کی ماں کا کردار ہمیشہ ادا کرنا ہوگا۔ کیا تم ہمیشہ یہ کردار پہن سکو گی۔ اسے پہن کر جی سکو گی۔ ؟ وقار نے بھی تمہیں فالتو شے سمجھ کر ہاتھ بڑھایا ہے۔ اُس نے اپنی ضرورت کی وجہ سے تم سے شادی کی بات کی ہے۔ ورنہ کل اگر تم اس کی ضرورت نہیں بن سکی تھی تو آج کیسے اور کیوں ؟ کل نورین راستے میں آ گئی تھی۔ کون جانے آنے والے کل میں کوئی اور نورین سفر کھوٹا کر دے۔ تم ادھورے سفر کو منزل نہیں سمجھ سکتیں۔ عمر بھر آدھی عورت بن کر نہیں جی سکتیں۔ بٹے ہوئے مرد کو کہاں کہاں تلاش کرتی پھرو گی ؟ کب تک دوسروں کی اُترن پہنو گی۔ کب تک جھوٹی زندگی گزارتی

رہو گی — کل انہی لوگوں نے تمہیں کس آسانی سے رد کر دیا تھا۔ آج یہی تمہیں کس طرح قبول کریں گے — ؟

سیمیں ! یہ آج بھی قبول تو کر رہے ہیں۔ ورنہ ایک اداکارہ کو کون قبول کرتا ہے ؟ یہاں اداکارہ کی سکرین پر اداکاری دیکھ کر خوش تو ہوا جا سکتا ہے، سراہا جا سکتا ہے لیکن بیوی کا رُتبہ کون دیتا ہے ؟ عورت کو داشتہ بنا کر، گرل فرینڈ سمجھ کر لوگ دِنوں، مہینوں، سالوں اپنے گھر میں رکھ سکتے ہیں۔ انہیں ایک گھر کی چھت دے سکتے ہیں۔ لیکن زمانے کی دھوپ سے بچا کر اسے اپنی چھاؤں نہیں دے سکتے۔ یہ سب بے ثمر درختوں کی مانند ہیں — یہ سہارا اور دلاسہ نہیں دیتے۔ صرف ضرورت پوری کرتے ہیں۔ اسی لیے ایسی عورت کو برت کر چھوڑ جاتے ہیں۔ اسے بیوی بنانا ضروری نہیں سمجھتے وہ صرف بستر میں ایک جسم کی حیثیت سے ساتھ رہ سکتی ہے۔ زندگی میں شریک نہیں ہو سکتی — بستر تو کئی عورتیں شریک کرتی ہیں — مگر زندگی میں کوئی کوئی شریک ہوتی ہے۔ ہم تم ان خوش بختوں میں سے ہرگز نہیں ہیں۔

یہ تم غلط کہہ رہی ہو — کتنے بہت سے لوگوں کو تو میں جانتی ہوں جو تمہیں بیوی بنانا چاہتے ہیں۔ تم رضامند نہیں ہوتیں — اُن سب میں اور وقار میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ وقار بھی تمہیں دوسری بیوی بنائے گا۔ دوسرے لوگ بھی تمہیں دوسری، شیریں یا چوتھی بیوی بنا کر ایک کار، کوٹھی، نوکر دے کر خود کسی اور بیوی کے پاس یا کسی اور دوست کی بیوی کے پاس، کسی محبوبہ کے پاس چلے جاتے ہیں — سب مجھے تنہا چھوڑ دیں گے

تہمینہ کہہ رہی ہے وقار کم از کم میرے ساتھ تو رہے گا، میرے پاس، میرے بہت قریب۔ وہ میرے برسوں کے انتظار کا کچھ تو قرض چُکائے گا۔ مجھے کچھ وقت تو دے گا — میں خوفزدہ ہوں۔

اگر میں نے آج انکار کر دیا تو میں اُسے ہمیشہ کے لیے کھو دوں گی۔ پھر وہ مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ پھر اس کے آنے کی اُمید بھی نہ رہے گی۔ میں یہ نہیں چاہتی — میں اُسے حاصل کرنا چاہتی ہوں!

تنّو ہو سکتا ہے تم اُسے حاصل کرنے کی بجائے کھو دو — دوسری صورت میں کیا تم اپنے آپ کو نہیں کھو دو گی؟۔

ہاں! لیکن اس کے بغیر جب جینے کی آس نہیں رہے گی۔ خواہش نہیں رہے گی۔ تب میں کیسے جیوں گی؟ اس کے بغیر میں رہ نہیں سکتی۔ اس کے بغیر زندگی، زندگی نہیں لگتی — میں زندہ ہونا چاہتی ہوں — میں جینا چاہتی ہوں۔ خوش ہونا چاہتی ہوں۔ زندگی کا بھرپور لُطف لینا چاہتی ہوں۔ میں زندگی کو زندگی کی طرح گزارنا چاہتی ہوں — مجھے بھی جینے کا، خوش ہونے کا حق ہے۔ میں جینا چاہتی ہوں — حقیقی معنوں میں جینا چاہتی ہوں۔!

تنّو! جینا تو ایک طرح کی مجبوری ہے۔ یہ مجبوری تو بہر صورت ساتھ رہے گی۔ وقار کو پا کر تم خود کو کہیں گم کر دو گی۔ باوجود تلاش کے تم خود کو ڈھونڈ نہیں سکو گی۔ اس تعلق میں صرف اور صرف دینا لکھا ہے — کچھ حاصل نہ کر سکو گی۔ کچھ بھی تو نہیں لے سکو گی۔ کیا تم ساری عُمر ہاتھ پھیلائے یونہی بیٹھی رہو گی — یونہی منگتی بن کر رہنا چاہتی ہو؟

ہم سبھی لوگ منگتے ہیں۔ کچھ مان لیتے ہیں اور کچھ نہیں مانتے۔ اب تک تو میں اُس کے انتظار میں آنکھیں پھیلائے بیٹھی تھی۔ اب ہاتھ پھیلا کے بھی دیکھ لیتی ہوں۔ اب پھر وہی سلسلہ، وہی انتظار، وہی پیاس، وہی رتجگے، تنہائی، اُداسی، دُکھ —! سوچتی ہوں میری تنہائی کو کوئی بہلاوا تو ملے گا۔ کوئی دلاسہ تو ملے گا۔ تنہائی کم تو ہو جائے گی — ورنہ

اس تنہائی کی اذیت سے مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔ میں اپنے آپ سے بہت گھبرا گئی ہوں — مجھے شدّتوں سے خوف آنے لگا ہے۔ مجھے کسی کے قرب کی ضرورت ہے — مجھے کسی اور کے ساتھ کی نہیں صرف وقار کے ساتھ کی خواہش اور ضرورت ہے۔ وقار میرے پاس ہو گا تو اس شدّت سے تنہائی کا احساس نہیں رہے گا — اس کے قریب ہونے سے میں تنہائی سے بچ جاؤں گی۔ مجھے تنہائی سے ڈر لگتا ہے — اب میں تنہائی کے خیال سے لرز جاتی ہوں! مجھے تنہائی سے اپنے اکیلے پن سے نفرت ہونے لگی ہے! نفرت!

پگلی ہو تم بھی — کسی کے پاس ہونے سے تنہائی کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ تمہاری تنہائی بھی پہلے کی نسبت بڑھ جائے گی۔ اب تو تم اداکاری کرتی ہو — کسی نہ کسی حد تک اپنا کتھارسس کر لیتی ہو۔ بعد میں کیا کرو گی؟ شائد وقار نہیں اداکاری کی اجازت نہ دے اور ممکن ہے تمہارے پاس اس کے لیے وقت بھی نہ رہے۔ گھریلو مسائل میں اس بُری طرح الجھ جاؤ گی کہ ہر پرفارمنس بھول جاؤ گی۔ جب تمہارے پاس اظہار کا کوئی طریقہ نہ ہو گا۔ تب تم کیا کرو گی؟ اپنا زہر کیسے باہر نکالو گی؟ جمع ہوتے ہوتے ایک دن تم میں اتنا زہر بھر جائے گا تم اسقدر زہریلی بن جاؤ گی کہ لوگ تم سے خوفزدہ ہو کر دُور بھاگیں گے — تمہارے سائے سے بھی گریز کریں گے۔ تب تم کیا کرو گی؟

سیمیں! کیا وقار مجھے اس زہر سے نہیں بچا سکے گا؟

تنّو! وقار تو خود اپنے زہر سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ہی تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ تمہارا زہر تو تمہی میں رہے گا — مرد کو یہ سہولت یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنا سارا زہر باہر نکال دیتا ہے لیکن عورت کے زہر کے بارے میں نہ وہ سوچتا ہے اور نہ ہی سوچنا چاہتا ہے۔ کوئی مرد یہ نہیں چاہتا کہ عورت اتنی باخبر ہو کہ اپنے زہر کا علم رکھتی ہو۔ زہریلی اور عالم عورت

تو بہت بڑا عذاب ہے۔ تم نے نہیں دیکھا کہ جب لڑکیاں بہت زیادہ پڑھ لکھ جاتی ہیں تو گھر کی میں بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ یا بیاہ کے چند روز بعد ہی طلاق کا جھومر ماتھے پہ سجائے میکے کی دہلیز پہ واپس لوٹ آتی ہیں۔ کچھ جاننے والی عورت کی ضرورت تو کہیں بھی نہیں ہوتی۔ خصوصاً ہمارے معاشرے میں باشعور عورت کا کوئی کام نہیں ہے کیونکہ وہ استحصال برداشت نہیں کرتی اور ظلم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے۔ وہ عورت کی ایکسپلائیٹیشن پہ چلاتی ہے۔ خوب شور مچاتی ہے۔ یہ بھی مرد کا ڈھونگ ہے جب وہ کہتا ہے کہ پڑھی لکھی ذہین، خوبصورت گفتگو کرنے والی عورت ہی آئیڈیل عورت ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ مرد اپنی ذہنی عیاشی کا سامان چاہتا ہے۔ ذہین اور خوش گفتار عورت سے بات کر کے مرد کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ زنا صرف جسمانی طور پہ کیا جائے کچھ مرد نظروں میں اور کچھ لفظوں میں عورت کے ساتھ زنا کرتے ہیں۔ جو اکثر جبراً کیا جاتا ہے یہ لاعلمی میں کیا جاتا ہے — کسی کی معصومیت سے فائدہ اٹھا کر۔ موقع دیکھ کر ایسا کیا جاتا ہے۔ بیشتر اوقات عورت خود بھی نہیں جانتی کہ مرد اُسے استعمال کر رہا ہے۔ وہ بے خبری میں استعمال ہوتی چلی جاتی ہے۔ ہر مقام پہ خرچ ہوتی ہے اور اکثر تو فضول میں خرچ ہوتی ہے لیکن یہ اسی صورت میں ہوتا ہے جب وہ خود عقل اور علم نہیں رکھتی اس لیے سادگی میں مرتی رہتی ہے۔ جو عورت عقل اور علم رکھتی ہے وہ اپنا استعمال سوچ سمجھ کے کرتی ہے۔ جہاں مفاد ہو — جہاں دام اچھے ملیں۔

آج عورت خود بھی خود کو بیچتی ہے مگر اقرار نہیں کرتی — وہ سچ سے ڈرتی ہے۔ اس لیے سچ نہیں بولتی۔ لیکن میں سچ سے نہیں ڈرتی اسی لیے تم سے کہتی ہوں کہ میں نے بارہا اپنی تجارت کی ہے۔ پہلے پہل تو میں انجانے میں لوگوں کا شکار بنی اور پھر میں جانتے بوجھتے ہوئے، سوچتے سمجھتے ہوئے، اپنا سودا کرتی رہی۔ پہلے میں بھی ایک اچھی اور معصوم لڑکی تھی لیکن شادی اور پھر طلاق نے مجھے بُری طرح توڑ کے رکھ دیا۔ جب میرے شوہر نے مجھ پہ جھوٹا الزام لگایا اور بے بنیاد شک و شبہے کی وجہ سے مجھے طلاق دے دی تو مجھ سے یہ صدمہ برداشت نہیں

ہو سکا۔ میں اس درد کو اپنی جان پہ نہیں جھیل سکی۔ لوگ یقین رکھتے ہیں کہ گھر سے باہر نکل کر دفتر جانے والی ہر لڑکی۔ ہر عورت بُری ہے۔ فاحشہ ہے — ہر عورت اپنے جسم کا سودا کرتی ہے۔ میں ایسی عورت نہیں تھی لیکن ان لوگوں نے، حالات نے، ظالم وقت نے مجھے اسے رنگ میں رنگ دیا — مجھے ایسا بنا دیا۔ کل میں سچ بلکہ برہنہ سچ بولنے سے ڈرتی تھی لیکن آج میں خوفزدہ نہیں۔ بُزدل نہیں، کمزور نہیں۔ جب میں سب سے بڑے خالق خُدا کے سامنے برہنہ ہوں تو ان انسانوں کے سامنے ننگی مورتی کی صورت کیوں نہیں کھڑی ہو سکتی۔ ہاں۔ میں بہت بُری ہوں اس لیے کہ میں اپنا آپ بیچتی ہوں۔ اس لیے بھی کہ میں مرد کی ضرورت محسوس کرتی ہوں۔ میں تنہائی سے تنگ آجاتی ہوں۔ چاہے کچھ پل کے لیے سہی مگر میرے اندر کی محروم عورت محبّت کی بھوکی ہے — میں توجہ چاہتی ہوں۔ جب کوئی مرد مجھ سے اقرارِ محبت کرتا ہے تو میری انا کو تسکین ملتی ہے۔ جب وہ چاہت کا اظہار کرتا ہے تو میرے نزدیک دُنیا کی سب سے بڑی حقیقت، سب سے بڑی سچائی یہی ہوتی ہے کہ کوئی شخص مجھے بھی چاہتا ہے۔ کسی کو میری ضرورت ہے۔ بس یہی بہانہ میری زندگی کی وجہ اور جواز ہے۔ میں جانتی ہوں یہ سب لمحاتی باتیں ہیں۔ یہ سب کچھ جھوٹ ہے۔ لیکن میں اس جھوٹ کو اس لیے سچ ماننے پہ مجبور ہوں کہ میں جینا چاہتی ہوں جینے کے لیے پیار اتنا ہی ضروری ہے جیسے زندہ رہنے کے لیے خوراک ضروری ہے۔ مجھ اچھی کو وقت نے بُرا بنا دیا۔ جب کبھی مجھے کوئی مضبوط، کوئی سچا سہارا مل گیا۔ اسی وقت میں ان جھوٹے سہاروں سے خود کو علیحدہ کر لوں گی۔ جو شخص مجھے تحفظ دے گا۔ چھپر چھاؤں دے گا — میں اس کے لیے پھر سے اچھی ہو جاؤں گی۔ میں بھی تب مانوں گی کہ مجھ میں کوئی ہنر ہے، کوئی خوبی ہے — لیکن تب تک۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے کچھ پل کے لیے اس جھوٹی زندگی کو بھی گزارنا ہوگا۔ میرے گرد ایسے لوگوں نے جال بُن رکھا ہے جن کے چُنگل سے میں بچ نکلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مجھے زندہ رہنے کے لیے، نوکری بچانے اور پروموشن کروانے کے لیے ایک نہیں کئی ہاتھوں سے

گزرنا پڑتا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو اس ظالم دُنیا میں رہنا ناممکن ہو جائے۔ میں جی ہی نہیں سکتی اور جینا میری مجبوری ہے۔ جب تک خدا میرے لیے نجات دھندہ نہیں بھیجتا مجھے یونہی ایک بھیڑیے سے دوسرے بھیڑیے کے مونہہ کا نوالہ بننا ہوگا۔ آج میں خود بھی جانتی ہوں کہ میں جو کچھ کر رہی ہوں وہ غلط ہے۔ میرا دل نہیں مانتا۔ میرا ذہن ان چیزوں کو، ان باتوں کو قبول نہیں کرتا لیکن میری بقا اسی میں ہے۔ جس طرح تمہاری بقا فی الحال وقار سے شادی کرنے میں ہے۔ وقار جو اپنی بیٹی شیری کی بھرپور جوانی سے خوفزدہ ہو کر اس کے شعور سے ڈر کر اُسے زبردستی اُس ماحول سے اِس ماحول میں کھینچ لایا ہے ـــ وہ سمجھتا ہے کہ اُس کی دوسری شادی میں الجھ کر شیری اپنی ماں کو اور پھر اپنے آپ کو بھول جائے گی ـــ مگر جوانی دیوانی ہوتی ہے ـــ کیا وہ خود یہ نہیں جانتا ـــ؟ اگر وہ اپنے لیے آتا تو برسوں پہلے آجاتا۔ اب وہ اپنے لیے نہیں شیری کے لیے تمہارے پاس آیا ہے۔ وہ تمہارے نام کی خاطر تمہارے پیچھے آیا ہے۔ وہ تمہیں حاصل کرنا تمہیں جیتنا چاہتا ہے تاکہ اُس کی اُس کی انا کو تسکین ملے۔ وہ نورین کی ہار کا بدلہ تم سے لینا چاہتا ہے۔ تم پہ احسان رہے گا کہ وہ تمہارے لیے آیا ہے۔ دراصل تو وہ خود خوش ہونا چاہتا ہے۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسقدر مصروف اور معروف عورت برسوں اُس کی منتظر رہی۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح تمہارا ناجائز استعمال کرنا چاہتا ہے۔ وہ بھی منافق اور خود غرض ہے۔ وہ بھی جھوٹا ہے۔ لفظوں کے جال سے تمہیں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہی کوشش جو اُس سے پہلے کئی اور لوگ کر چکے ہیں۔ وہ ناکام رہے تھے لیکن یہ شخص جس کا نام وقار ہے اور جس کا تم نے سالوں انتظار کیا یہ تمہیں پھنسانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اُسے علم ہے کہ تم تو پہلے ہی اس کی دُوری میں پھنسی ہوئی تھی ـــ جو پہلے شکار ہو چکا ہو وہ کسی اور کا شکار کیسے بن سکتا ہے؟ لیکن افسوس ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی نہ کسی جال میں پھنس ہی جاتے ہیں۔ ماننا پڑتا ہے کہ مرد بہت کامیاب شکاری ہوتا ہے۔ بہتر بن شکاری ہونے کی وجہ اس کی موقعہ شناسی اور عیاری ہے ـــ وہ جانتا ہے کہ کون کب اور کس طرح جال میں آئے گا؟

اس کی اکثر توقعات پوری ہو جاتی ہیں ـــ وقار کی بھی توقع پوری ہو جائے گی۔ وہ اس متوقع کامیابی کے لیے پہلے سے تیار ہوگا ـــ تمہاری خوشخبری اُس کی حیرانگی کا باعث نہیں بنے گی۔ وہ اس یقینی لمحے کا منتظر ہوگا ـــ ہے نا ـــ؟

ہمیں ـــ تم کچھ بھی کہو ـــ تمہیں علم ہے میں نے برسوں اس کا انتظار کیا۔ اسی کی وجہ سے میں کئی آنکھوں کے خواب توڑنے کی گناہگار ہوئی۔ اگر اُس نے مجھ سے محبت نہ بھی کی ہو تو کیا ـــ میں نے تو اس سے محبت کی ہے۔ آج میں جس مقام پر ہوں ـــ اُس تک پہنچانے والا وہی ہے آج جو کچھ بھی میں ہوں اس میں، اس شہرت، عزت اور فن میں وہ برابر کا حصہ دار ہے۔ سارا کریڈٹ اسی کو جاتا ہے۔ آج اگر وہ اپنا حصہ لینا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے ـــ میں خراج دینے کو تیار ہوں۔ اگر وہ مجھے استعمال کرنا چاہتا ہے تو جہاں اتنے لوگوں نے مجھے استعمال کیا ہے وہاں ایک اور سہی ـــ اگر اُسے کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو میں ہر نوعیت کے نقصان اٹھانے کے لیے تیار ہوں ـــ اگر ہارنا ہے تو اس بازی کو بھی ہار دیں گے۔ لیکن بازی کھیلوں گی ضرور۔ اس کے بعد ہی تو ہار جیت کا فیصلہ ہوگا ـــ میں کسی بھی فیصلے کو سننے، ماننے، جھیلنے، برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے مقابل میرا دشمنِ جاں آئے تو سہی ـــ اگر وقار کے ہاتھوں ہی یہ بربادی لکھی ہے تو یونہی سہی۔ میں اپنے لہو سے یہ داستان لکھتی آئی ہوں ـــ اپنے لہو سے ہی اس داستان کو مکمل کروں گی ـــ اگر میری خوشی کی قیمت نے موت کی صورت رکھی ہے تو میں اس موت کو بھی قبول کرتی ہوں ـــ میں اس طرح کی زندگی کی بجائے مرنا پسند کروں گی۔ اب میں موت کے لیے تیار ہو گئی ہوں ـــ میں اس آخری موت کا مسکراتے ہوئے استقبال

کردوں گی ــــ!

تنو! تم یہ سب اس لیے کہتی ہو کہ تم جذباتی ہو۔ اسے ہر قیمت پہ حاصل کرنا چاہتی ہو چاہے اس کے لیے تمہیں خود موت ہی کو قبول کرنا پڑے۔ تب بھی تم اس کی خواہش کرو گی۔ تم اکثر دل سے فیصلے کرتی ہو، دماغ سے نہیں۔ کبھی کبھی دل کے فیصلے بہت ظالم ہوتے ہیں ــــ جن کے نتیجے میں انسان کو بہت کچھ کھو دینا پڑتا ہے ــــ اور پھر انسان پچھتاوے کے سمندر میں بہتا چلا جاتا ہے، کل کہیں تمہیں بھی پچھتانا نہ پڑے۔ یہ پچھتاوا اس پچھتاوے سے کہیں زیادہ ہو گا۔ جو کہ تم نے اسے لوٹا دیا ــــ یا پھر اسے پا کر کھو دیا۔ تم اس کا بھرم رہنے دو۔ تمہارے ذہن میں اس کا جو تاثر قائم ہے وہی رہنے دو ــــ وہ ہٹ گیا ــــ یا ٹوٹ گیا تو تم بکھر جاؤ گی۔ تمہیں کوئی بھی نہیں سمیٹ سکے گا۔ جس اُمید کے سہارے تم جیتی آئی ہو۔ اسی کے ساتھ مر جاؤ تو بہتر ہے۔ ورنہ تم اپنا بکھرا وجود دیکھ نہیں سکو گی ــــ آئینے سے نظریں چراؤ گی ــــ کیونکہ تمہارا اپنا چہرہ درد کی جھریوں سے بھرا ہو گا۔ آئینے میں تو دراڑیں پڑھی جا سکیں گی لیکن تم پھر پڑھے بغیر رہ جاؤ گی۔ اپنے بکھرے ہوئے ذروں کو سمیٹ نہیں سکو گی ــــ نہ ہی خود کو اس حال میں تم دیکھ سکو گی۔ میں اُس وقت سے خوفزدہ ہوں۔ ابھی بھی وقت ہے ــــ کچھ دیر کے لیے سوچ لو ــــ لوٹ آؤ!

سیمیں! میں اب کچھ بھی نہیں سوچنا چاہتی۔ میں وقار سے علیحدہ ہو کر نہ کچھ سوچنا چاہتی ہوں، نہ دیکھنا چاہتی ہوں اور نہ ہی جینا چاہتی ہوں۔ اس وقت وقار ہی میری سب سے اہم ضرورت ہے۔ مجھے وقار چاہیئے۔ میں ہجر کی آگ میں جلتے جلتے راکھ ہو رہی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ کچھ دیر بعد راکھ بھی نہ رہے صرف دُھواں باقی رہ جائے۔

وقار ہی تمہیں چاہیئے۔ چاہے ادھورا وقار ملے۔ کئی خانوں میں بٹا ہوا وقار تمہاری تکمیل کیسے کرے گا؟

ادھورا ہی سہی ــــ ہے تو وقار ــــ میرا اپنا وقار ــــ!

تمہارا اپنا وقار ــــ؟

ہاں ــــ مکمل نہیں لیکن اُس کا کچھ حصّہ تو میرا اپنا ہو گا ــــ جس پہ میرا حق ہو گا ــــ صرف اور صرف میرا حق ــــ!

تنو! حق تو صرف مرد کا ہوتا ہے۔ عورت کی کتاب میں صرف فرائض لکھے جاتے ہیں۔ وہ عورت کو فرض کی بھٹی میں راکھ ہونے کے لیے ڈال دیتا ہے۔ مرد عورت کو راکھ ہوتے ہوئے دیکھنا اپنا حق سمجھتا ہے ــــ جائز حق ــــ!

میرا نہیں ــــ نہ سہی ــــ اس کا بھی مجھ پر کچھ تو حق ہو گا نا ــــ؟ اسی حق کے جواب میں میں تہمینہ حسن سے تہمینہ وقار بن جاؤں گی۔

تم اس کے لیے اپنا نام بھی چھوڑ دو گی۔ یہی نام تو تمہاری شناخت ہے۔ بغیر شناخت کے رہ سکو گی؟

جب شناخت کا حوالہ تبدیل ہو رہا ہے تو نام بھی بدلے گا۔ میری شناخت تو وقار ہی سے ہے ــــ

اچھا ــــ؟ پھر تم اداکاری بھی چھوڑ دو گی ــــ ہے نا ــــ؟

ہاں ــــ اب میں صرف زندہ پرفارمنس دوں گی۔ سکرین سے باہر نکل کر حقیقی زندگی کا ایک کردار ادا کروں گی ــــ یادگار کردار ــــ ناقابلِ فراموش کردار ــــ جس کردار کو ادا کرنے کی میں برسوں سے آرزومند تھی ــــ میری خواہش پوری ہو گی ــــ

ہاں ایک خواہش پوری ہو گی ــــ کئی تشنہ رہ جائیں گی ــــ میں چاہتی ہوں تم اور تمہاری کوئی خواہش تشنہ نہ رہے ــــ تمہیں سُکھی رہنے کی دُعا دیتی ہوں ــــ لیکن ــــ اگر کبھی اس کردار کو ادا کرتے کرتے تھک جاؤ ــــ تو لوٹ آنا ــــ میں تمہارے سکھ دُکھ میں کل بھی اتنی ہی شریک ہوں گی جتنی آج ہوں۔ اس فلیٹ کی جو چابی تمہارے پرس میں موجود ہے اُسے اپنے پاس ہی رہنے دینا۔ تمہی نے کہا تھا کہ جینے کے لیے کوئی آس، کوئی اُمید بہت ضروری ہے۔ یہ اس دروازے کی چابی ہی ــــ

نہیں تمہاری امید بھی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے اندر کی اُس دیوار کو کبھی نہیں گرا سکتیں جسے لوگ فن کہتے ہیں۔ تم اس اونچی دیوار کو پھلانگ کر کسی اور زمین پر بھی قدم نہیں رکھ سکتیں۔ یہ دیوار بہت مضبوط ہے۔ اس کی بنیادوں میں تم نے اپنا لہو شامل کیا تھا۔ زندگی کے ہر کردار کو تم نے برسوں ایک ایک اینٹ کی طرح جمع کیا۔ پھر انہی مبارک اینٹوں سے یہ دیوار بنائی۔ اپنی فنی عُمر کی دیوار تمہارے جینے کا سہارا بنے گی۔ اسی کے سائے میں بیٹھ کر تم اپنے سُکھوں کی کہانی کہو گی۔ میں تمہیں کبھی بھی دُکھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ تم اپنی کس کس عادت کو تبدیل کر سکو گی۔؟ اب تم عمر کے اُس حصّے میں نہیں ہو۔ جہاں سمجھوتہ ممکن ہو۔ جہاں تبدیلی آسان ہو۔ جہاں فریب کی زندگی گزاری جا سکتی ہو۔ خود کو دھوکہ مت دینا۔ خود کو کبھی جھٹلانا نہیں۔ جب بھی خود سے لڑتے لڑتے تھک جاؤ۔ اسی فلیٹ میں واپس چلی آنا۔ میں کوشش کروں گی کہ تم سے دُور علیحدہ رہنے کی عادت اپنا لوں۔ یہ عادت تو مجھے سیکھنا ہی ہو گی۔ تمہاری کئی دوسری عادتیں بھی مجھے اپنانا ہوں گی۔ اداکاری بھی کرنا ہو گی لیکن میں تم جیسی نہیں بن سکتی تمہاری جگہ نہیں لے سکتی۔ کوئی بھی تم جیسا کیسے ہو سکتا ہے۔ تم جیسا کیسے بن سکتا۔ تمہاری جگہ کیسے لے سکتا ہے؟ تم۔ تم ہی ہو۔ تم ہی رہو گی۔ میں تم نہیں بن پاؤں گی۔ میں اتنی اچھی۔ اسقدر عمدہ اداکاری کہاں کر سکتی ہو؟ میں تو تمہاری پرچھائیں بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اپنی زندگی میں تمہاری کمی کو پورا کرنے کے لیے مجھے کئی بہروپ بدلنا پڑیں گے۔ شائد کسی حد تک تمہاری کمی پوری کر سکوں۔ مگر وہ بھی شائد۔۔! یہ کہہ کر سیمیں خاموش ہو گئی لیکن اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو کئی باتیں کرتے سنائی دیئے۔ جنہیں دُھرانے کی ضرورت نہیں۔ بہت سی باتیں کہنے کی نہیں صرف اور صرف سمجھنے کی ہوتی ہیں!

۴

سیمیں اور تنّو کی جدائی کو ایک عرصہ ہو گیا۔ اتنا عرصہ کہ لوگوں کے حافظوں میں تہمینہ حسن کا نام ایک بھولی بسری یاد کی طرح ادھ لکھا رہ گیا۔ جو صرف حوالے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

سیمیں نے تنّو کی جگہ تو نہیں لی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اُس نے اپنی ایک جگہ بنالی تھی۔ اب وہ بھی ٹیلیویژن کی ایک معروف اور جانی پہچانی اداکارہ تھی۔ اس اداکاری کے ساتھ ساتھ وہ اپنا بہت پرانا کردار یعنی دفتر میں کام کرنے والی سیمیں کا بھی اسی انداز سے ادا کر رہی تھیں۔ سیمیں کہیں بھی جاتی تہمینہ کا سایہ اس کے ہمراہ ہوتا۔ دفتر۔ سڑکیں۔ ٹی وی اسٹیشن۔ فلیٹ۔ سب جگہوں پہ تنّو کا چہرہ، تنّو کی آواز بھٹکتی دکھائی دیتی۔ اُس نے ہر گھڑی تہمینہ کی آہٹ سُنی۔ وہ اس کی منتظر تھی۔ وہ اس کی عادی ہو چکی تھی اسی لیے اس کے جانے کے بعد اُس کی کمی بہت شدت سے محسوس کرتی تھی۔ سیمیں تنّو کی شکست سے خوفزدہ تھی اور اندر ہی اندر کہیں اس خیال سے لرز جایا کرتی تھی۔ وہ بھی جیسے جا کر سبھی کچھ بھی بھول گئی تھی۔ نہ کوئی اطلاع نہ چٹھی۔ سیمیں ہر وقت اُس کی طرف سے کسی اطلاع کی منتظر رہتی۔ جس طرح اس کمرے کی خاموش دیواریں اُس کی جدائی میں سسکتی تھیں۔ جس طرح فلیٹ کی ہر شے دیواروں کے ساتھ انتظار میں شریک تھی۔ لیکن وہ تمام اشیاء اظہار نہیں کرتی تھیں اس لیے سیمیں سے کچھ نہ کہتیں۔ ان کے پاس اپنے دُکھ کے اظہار کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ بھی تو حساس تھیں۔ زود رنج تھیں۔ وہ اپنے دُکھ درد ایک دوسرے کے چہرے سے پڑھتیں۔ جب سیمیں فلیٹ میں نہ ہوتی۔ ورنہ سیمیں کے سامنے تو وہ تنّو کا ذکر بھی نہ کرتیں۔ تنّو کو یاد کرتے ہوئے سیمیں اکثر آبدیدہ ہو جایا کرتی تھی۔ کوئی بھی اُس

کے آنسو نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ سیمیں روتی تو سارا گھر رونے لگتا۔ سیمیں ہنسی تو گھر بھی کھلکھلا کے نہیں پڑتا۔ وہ مُسکراتی تو گھر بھی دھیرے سے مُسکرا دیتا۔ سارا گھر سیمیں کے موڈ کے ساتھ چلتا۔ سیمیں کے دُکھ میں اُس کا دکھ اور سیمیں کے سُکھ میں اس کا گھر بھی سُکھی رہتا۔ موسم بدلتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ سیمیں کی زندگی میں بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا۔ اگر نہیں بدلا تھا تو تنّو کے لیے جذبہ جو اب بھی وہی تھا اور فلیٹ جس میں آج بھی سیمیں تنّو کی آہٹ کی منتظر تھی۔ کسے خبر تھی کسی دن ۔ کسی پل تنّو لوٹ آئے وہ کمرہ پھر سے تنّو کی آواز سے زندہ ہو جائے۔ برسوں کی تھکی تھکی باتیں۔ گزرے لمحے ایک یاد کی صورت اب بھی سیمیں کے گرد پڑاؤ ڈالے بیٹھی تھیں۔ منتظر تھیں کہ کب اچانک تہمینہ اس منظر میں واپس آ جائے۔ وہ ایک سرد شام تھی۔ سیمیں اُس روز کسی کھیل کی ریکارڈنگ کے لیے آؤٹ ڈور گئی ہوئی تھی۔ اس کی جلد واپسی ناممکن تھی۔ اسی شام کی اُداسی میں سیمیں کے فلیٹ کے بند تالے کو تنّو کی اُمید کی کُنجی نے کھولا۔ یہ صرف ایک دروازہ ہی نہیں تھا، ایک گزری زندگی اور ایک نئی زندگی کا نشان بھی تھا یہاں تہمینہ کا ماضی زندہ تھا۔ اور مستقبل آواز دے رہا تھا۔ تنّو آج اس زندگی میں پھر سے لوٹ آئی تھی۔ اس زندگی کو بسر کرنے کی سزا اُس نے خود تجویز کی تھی۔ یہ حقیقت اُس نے خود قبول کی تھی۔ کھُلی آنکھوں سے وہ واپسی کے سفر کا خواب دیکھ رہی تھی۔ آج پھر وہ وہیں تھی جہاں سے اُس نے پہلا قدم اٹھایا تھا۔ جہاں سے اُس نے اپنی فنّی زندگی کی کامیابی اور پھر عروج دیکھا تھا۔ وہی پرانا فلیٹ تھا جہاں برسوں پہلے ایک عرصے تک سیمیں اور تہمینہ اکٹھے رہے تھے۔ جہاں انہوں نے اپنے سُکھ دُکھ بانٹے تھے۔ دوستی جیسی شے حاصل کی تھی۔ آج وہی دوستی اُسے یہاں واپس کھینچ لائی تھی۔ اور وہ جو شکستہ دل چنگار پاؤں تھی آج اس پناہ گاہ کے تصوّر اور موجودگی کو کسی نعمت سے کم نہیں جان رہی تھی۔ اب اس دروازے کے اندر تھی۔ جہاں سے باہر وہ اپنے سارے غم، سارے برس چھوڑ آئی تھی۔ اس دروازے سے اندر آ کر اُس نے دیکھا سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ اگر کچھ بدلا تھا تو تہمینہ کا گزرا ہوا وقت۔

جسے اُس نے کسی لباس کی طرح بہت شوق سے پہنا ضرور مگر پھر اُسے مجبوراً اپنے ہی ہاتھوں اُتار کر پھینکنا پڑا۔ تہمینہ کو یہ لباس وقار نے پہنایا تھا۔ آج وہ ہار گئی تھی۔ اسی ہار کو لیے وہ ان دیواروں میں آئی تھی۔ اب وہ تہمینہ وقار نہیں۔ تہمینہ حسن بن کر آئی تھی۔ وہی پرانی تہمینہ حسن۔ وہی جس نے بہت جدوجہد کرنے کی عادت ڈال لی تھی۔ وہی جس نے اپنے پرانے کردار کو ہی اصل جانا تھا۔ وہ تہمینہ وقار کا کردار ادا کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ وہ شیری کی ماں کے کردار میں بھی خود کو میں فٹ محسوس کرتی رہی تھی۔ جب اس کردار کو ادا کرتے کرتے وہ اپنا آپ بھول گئی تھی۔ لیکن وقار نے اسے اُس کی حیثیت یاد دلا دی تھی۔ وہ تھی ہی کیا۔ ایک دوٹکے کی اداکارہ۔ جو عمر بھر دوسروں کے لکھے فقرے بولتی رہی۔ جب اُس نے اپنے فقرے کہے تو وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ اس اداکاری کی تو وہ توقع نہیں رکھتا تھا اور اس کی قیمت بھی وقار نے ادا نہیں کی تھی پھر کیوں یہ ہوا۔؟

اسی کیوں نے تہمینہ کے دن رات سوچوں کے الاؤ میں سلگتے گزار دیئے اور پھر وہ اس آگ سے نکل کر دوسری آگ کی طرف آ گئی۔ وہ اپنی پرانی آگ میں ہی جلنا چاہتی تھی، وہ جانتی تھی یہ آگ اُسے راکھ کر دے گی۔ لیکن یہ راکھ اسے قبول تھی۔ اسی لیے اُس نے خود کو اِن شعلوں کے حوالے کرنے کا ارادہ کیا اور انہی مانوس دیواروں میں لوٹ آئی۔ یہ دیواریں اُسے محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ اُسے تحفظ دے رہی تھیں۔ اپنے پن کا احساس یہاں قدم رکھتے ہی اُسے ملا تھا۔ تنّو نے جان لیا تھا کہ بس اب اُسے یہیں خاک ہونا ہے۔ وہ اتنی دُور سے بھاگتی آ رہی تھی کہ یہاں آتے ہی گر پڑی۔ تھکن کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب منزل سامنے ہو۔ وہ تھکن سے چُور روح اور بدن لیے یہاں پہنچی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ پُرسکون نیند کی آغوش میں تھی۔ نیند جو اُسے اس وقت مہربان ماں کی گود جیسی ملی تھی۔۔۔!

شام ڈھلی۔ سرد رات کی تاریکی میں سیمیں نے فلیٹ کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ دوسرے

ہی لمحے اُسے معلوم ہوگیا کہ وہ ایک کھلے دروازے کو دوبارہ کھولنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ظاہر ہے یہ بے سود تھا۔ سیمیں نے دروازہ کھولا۔ حیرت سے لحاف میں سوئی ہوئی تنو کی طرف دیکھا۔ تنو کے چہرے پہ وقت نے دُکھ کی جو تحریر لکھی تھی اسے وہ نم آنکھوں کی وجہ سے پڑھ نہ سکی تھی۔ وہ اسی اندھے وقت سے ڈرتی تھی جو آج اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ سیمیں بہت رنجیدہ تھی۔ جب وہ اذیت برداشت نہ کر سکی تو سوئی ہوئی تنو سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کچھ ہی دیر بعد لحاف میں ایک نہیں دو آوازیں سسک رہی تھیں۔ ایک نہیں دو بدن دو روحیں سلگ رہی تھیں۔ سیمیں نے بھی کچھ نہیں پوچھا تھا اور تنو نے بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ سب سوال جواب، تمام گفتگو آنسوؤں نے کر لی تھی۔ اب لفظوں کے لیے کوئی بات باقی نہیں بچی تھی۔ اسی وقت دیواریں خاموشی سے، دُکھ سے دونوں کا درد اپنے دِلوں میں محسوس کر رہی تھیں۔ وہ دونوں گھنٹوں ایک دوسرے سے لپٹی روتی رہیں۔ بہتے ہوئے آنسوؤں نے تمام فاصلے مٹا دیئے تھے۔ اب قریب رہ گئی تھی تعلق رہ گیا تھا۔ دوستی رہ گئی تھی۔ زندگی رہ گئی تھی۔

کچھ دنوں بعد اخباروں میں ایک عرصے کے بعد تہمینہ حسن کے نام سے شہ سُرخی لگی تھی۔

تہمینہ حسن کی واپسی

سیمیں تنو کا دُکھ اپنے بدن پر نہیں جھیل سکی تھی۔ یہ دُکھ اُس کی برداشت سے باہر تھا وہ اس لیے بہت دُور چلی گئی تھی۔ وہ کسی تازہ کھُدی ہوئی قبر میں جا چھُپی تھی۔

سیمیں جو پہلے تنو کو اپنے ساتھ چلنے کو کہتی تھی۔ ایسی جگہ جہاں کوئی انہیں جانتا پہچانتا نہ ہو۔ اب وہ اپنی خواہش کے مطابق۔ ایسی ہی جگہ پہ خود چلی گئی تھی۔ جہاں کوئی آواز اُس تک

نہیں پہنچ سکتی تھی۔ سیمیں کی موت پر المیہ کالم لکھے گئے۔ اظہارِ افسوس بھی کیا گیا۔ خصوصی تعزیتی پروگرام بھی ہوئے۔ لیکن تہمینہ کی دلی کیفیت سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ تہمینہ نے اپنی جان پر جو صدمہ سہا تھا اُس نے اُسے بُری طرح جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اب وہ کسقدر مضطرب اور پریشان رہتی۔ کسے خبر تھی؟ اس کی روح کے داغ نہ کسی نے دیکھے، نہ جانے، کوئی بھی اس کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ جو کچھ بھی جانتا تھا تو وہ سب سطحی اور ظاہری تھا۔ تنو کی روح اور دِل پہ لگے گھاؤ کبھی مندمل نہ ہو سکتے تھے۔ ان زخموں پہ تو وقت بھی مرہم نہیں رکھ سکتا تھا۔ کوئی بھی اس کے درد میں شریک نہیں تھا۔ کچھ لوگ وقتی طور پہ اس کے قریب ضرور آئے تھے لیکن اب سب لوگ جا چکے تھے اب وہ تنہا ہی تھی۔ وہ تنہا رہ گئی تھی، بالکل تنہا اور اکیلی۔ اگر کوئی اس کا دوست تھا تو خاموش کمرہ۔ جو اُسے خاموش دلاسہ دیتا تھا۔ اور اہم انسان اظہار کے عادی ہو جاتے ہیں۔ خاموش چہرے اور خاموش دیواروں کے دلاسے بھی ہمیں تسلی نہیں دے سکتے۔ یہی وجہ تھی کہ تہمینہ کے لیے کچھ بھی وجہ تسلی نہیں تھا۔

وہ اپنے اکیلے پن سے لڑتی جھگڑتی۔ تنہا ہی زندگی کا بوجھ اٹھائے پھرتی تھی۔ تہمینہ حسن نے اپنی شدید اور بے انت تنہائی کو مصروفیت کے خول میں چھپانے کی اداکاری شروع کر دی تھی۔ اسی لیے وہ دِن رات کام کیا کرتی۔ اداکارہ تھی۔ اداکاری نہ کرتی تو کیا کرتی؟

پہلے تو وہ صرف ٹیلیویژن کی اداکارہ تھی۔ اس کے بعد اس نے سٹیج پر بھی اداکاری شروع کر دی۔ اس کے بعد وہ بڑی سکرین فلم تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں بھی وہ زبردستی ہی خود کو کھینچ لائی تھی۔ اس نے جبر کر کے یہ طویل اور کٹھن سفر طے کیا تھا۔ کانٹوں بھرے اس راستے پر اس کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے اور جسم کے ساتھ ساتھ روح پر بھی چھالے پڑ گئے تھے۔ وہ خود ایک آبلے کی صورت ہو گئی تھی۔ وقت نے اسے فلموں کی بڑی اداکارہ بھی بنا دیا تھا۔ اب وہ جھوٹ اور منافقت کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ اپنا اصل میک اپ کی تہوں میں چھپانے کی بھرپور کوشش کرتی۔ مسکراہٹ اور اداؤں میں اپنے دِن اپنی شامیں گزارتی۔ لیکن جب شام کے بعد رات آتی تب۔!

سیاہ راتوں کی تنہائی میں جب بھی وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھتی تو خود سے سوال کرتی۔

تہمینہ حسن تم کیا تھیں — اب کیا ہو۔ کیا بن گئی ہو — تمہاری منزل کہاں ہے —؟

تمہارا مقصد کیا ہے — تم آخر کیوں زندہ ہو؟

ان سوالوں کے جواب میں اسے اپنی سسکیاں سنائی دیتیں — اس سے زیادہ وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ زیادہ سوچتی تو نروس بریک ڈاؤن ہو جاتا اور پھر اسے کئی دن ہسپتال میں گزارنا پڑتے — جہاں وہ بستر پہ پڑے پڑے بیمار ہو جاتی — سوچتے سوچتے تھک جاتی اور نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ ہوش میں آتے آتے انتہائی نگہداشت کے کمرے میں پہنچ جاتی۔

اسی لیے اب وہ زیادہ سوچنے سے گریز کرتی۔ اب وہ خود کو ہوش میں نہیں رہنے دیتی تھی۔ وہ خود سے ہم کلام بھی نہیں ہوتی تھی — کہ اُسے سچ سے ڈر لگتا تھا۔ اسی سچ کو نہ دیکھنے کے لیے وہ خود کو چھپا لیتی تھی۔ نیند کی گولیاں اور سائڈ ٹیبل پہ پڑے گلاس اور بوتل میں اس کی مدہوشی اس کی منتظر ہوتی۔ تہمینہ ان چیزوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اُس نے خود کو عادی بنا لیا تھا۔ اب یہ چیزیں اس کی ضرورت بن چکی تھیں — لوگوں کو جس تہمینہ حسن کی ضرورت تھی وہ ٹی وی سٹار اور فلم سٹار تہمینہ حسن تھی۔ جس کا نام بکتا تھا جس کا نام چلتا تھا — جو زیورات کی چمک اور میک اپ کے رنگوں میں رنگی ایک گڑیا تھی — ایک شو پیس تھی — جسے ہزاروں لوگ دیکھتے تھے اور جس کے لاکھوں چاہنے والے تھے — جس کی فلمیں ہٹ ہوتی تھیں اور جس کے نام پہ کئی مصنوعات بکتی تھیں۔

سبمیں کی تنّو کو تو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کسی کو اس کی خواہش، اس کی ضرورت نہیں تھی — صرف سبمیں کو ضرورت تھی — لیکن اب وہ کہاں تھی؟ جب تنّو بہت اُداس ہوتی تو کمرے میں سبمیں سے باتیں کرتی رہتی — یا رات کی تاریکی میں چھپ کر اُس کی خاموش قبر سے کچھ کہہ لیتی۔ دن کے اُجالے میں وہ اس قبر کی مٹی کے پاس بھی نہیں جا سکتی تھی کہ لوگ تہمینہ حسن کو تو ہر شخص دیکھتا اور جانتا تھا لیکن تہمینہ حسن کے اندر کی تنّو کو لوگ نہیں جانتے تھے۔

تہمینہ حسن کے اندر پوشیدہ تنّو آج ٹوٹے ہوئے آئینے کی صورت تبدیل ہو گئی ہے۔ اُس کا اپنا عکس بھی دھندلا گیا ہے۔ وہ خود کو بھی نہیں پہچان پاتی۔ اُسے اپنے آپ کو پہچاننے میں کچھ وقت لگتا ہے — شائد وہ خود کو بھولتی جا رہی ہے — یا پھر بھول چکی ہے۔ کبھی کبھی آئینے میں اُسے اپنا آپ ایک دیوار کی شکل میں نظر آتا ہے — اینٹوں کی دیوار، گارے اور مٹی کی دیوار — جذبوں کی دیوار — دُکھوں کی دیوار — اب وہ ایک گرتی ہوئی دیوار ہی تو ہے۔ کسے خبر کب یہ دیوار بھی ڈھے جائے۔؟

اب بھی اس کے ڈھے جانے پہ بہت ہنگامہ ہوگا۔ جیسے اس کی واپسی پر ہوا تھا — جیسے سبمیں کی موت پر ہوا تھا — جیسے اس کے فلم لائن میں آنے پر ہوا تھا — ایسے ہی اس کے جانے پر بھی ہوگا۔ اخباروں رسالوں میں اس کے نام پر کالم شائع ہوں گے — مختلف ادارے تعزیتی پروگرام پیش کریں گے۔ اخباروں میں، رسالوں میں ایک اور سُرخی کا اضافہ ہو جائے گا۔

تہمینہ حسن کی رخصتی

آواز

آواز

فاؤنٹین ہاؤس کے بارے میں میں بہت کچھ سُن چکی تھی۔ اس ماحول کو دیکھنے اور ان لوگوں کو جاننے کا تجسس کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ اس عمارت میں پہلا قدم رکھتے ہی جیسے میرے ذہن پہ چھائی ہوئی ساری دُھند چھٹ گئی ہو۔

مشتبہ نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے ایک شخص نے سوال کیا

جی کس سے ملنا ہے آپ کو ؟

میں مطلوبہ شخص کا نام لے کر اس باغ کی جانب چل پڑی۔ گیلی گھاس نے میرا استقبال کیا۔ نرم گھاس میں مجھے اپنا آپ دھنستا ہوا محسوس ہوا کیا یہ جگہ میرے لیے اجنبی ہے ۔۔؟ کیا یہ لوگ میرے لیے پرائے ہیں ؟

اپنے سوال کا جواب نفی میں پا کر میں خود بھی متحیر تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ اب سے پہلے میں کبھی بھی اس بستی میں نہیں آئی تھی۔ اسے میں نے بستی کیوں کیا ؟ شائد اس لیے کہ یہ ان لوگوں کی اپنی دُنیا ہے جہاں یہ تمام لوگ ہم مزاج ہوتے ہوئے، ایک ہی مرض میں ایک ہی کیفیت میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف اور جُدا جُدا تھے۔ میں بھی اس وقت اسی عمارت کا حصّہ ہوں۔ جہاں نارمل اور ابنارمل ۔۔ ہوشمند اور دیوانے کے بیچ کوئی واضح فرق نہیں دیکھ پائی۔ بہت سے چہروں پہ میں یاس کے سوا کوئی اور ایسا رنگ نہیں دیکھ پائی جو انہیں ذہنی یا نفسیاتی مریض ثابت کر سکتا ہے۔ ان کے چہروں پہ زندگی نہیں ۔۔ موت کی پرچھائیں ہے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ یہ پژمردگی یہ اُداسیاں تو ہم سب کا سرمایہ ہیں۔ ہماری دھرتی پہ سرسوں پھولنے کا موسم آتا ہے اور خزاں درختوں کا حُسن تباہ کر دیتی ہے ۔۔ ہر جانب ویرانی بکھری دِکھائی دیتی ہے۔ لیکن ایک ایسی بھی رُت ہے جو کبھی بولا نہیں کرتی۔ ہمیں جانے کس کی بددُعا لگی ہے کہ ہم سُکھ نہیں

دیکھ سکتے ۔۔ ہم خوش نہیں ہو سکتے۔

بہار کی رنگینیاں اور دلفریبیاں ہمارے سیاہ بختوں میں نہیں ہیں ۔۔ جانے کب وقت پہلو بدلے گا۔ جانے کب سورج کی کرنیں نئے سویرے کی نوید دیں گی۔

مجھے تو وہ لوگ اپنے سے مختلف محسوس نہیں ہوئے۔ کیا وہ ہم سب جیسے نہیں ہیں ۔۔؟

نہیں ۔۔ ان میں اور ہم میں فرق ہے۔ وہی جو قید اور آزادی میں ہوتا ہے ۔۔ دیوار سے اِدھر اور دیوار سے اُدھر کے منظر میں فرق ہوتا ہے۔ جو صبح اور شام میں ہوتا ہے۔ جو سُکھ اور دُکھ میں ہوتا ہے ۔۔ جو فرق میں نہیں جان سکی۔ معلوم نہیں اس میں قصور میری نظر کا ہے یا اس ماحول کا ۔۔ اس فاؤنٹین ہاؤس کا جہاں میں پہلی مرتبہ گئی تھی۔

اس ماحول نے مجھ پر بھی اثر کیا اور مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں بھی انہی ہاؤس ممبرز میں سے ہوں۔ وہاں کے رہنے والوں کو نہ تو دیوانہ کیا جاتا ہے اور نہ ہی مریض۔ بلکہ وہ سب فاؤنٹین ہاؤس کے ممبر کہلاتے ہیں ۔۔ لیکن فرق تو فرق ہی ہے۔ ہمارے لیے ہاؤس ممبر اور سٹاف ممبر میں تفریق کرنا مشکل تھا۔ سب لوگ مصروف تھے وہ یا تو سورج کی روپہلی کرنوں اور سردیوں میں سورج کی مہربان گرمی کے جادو میں کھوئے ہوئے تھے یا پھر اپنے آپ میں ۔۔ اس کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ ابھی میں یہی سوچ رہی تھی کہ ایک مسکراتے ہوئے چہرے نے خوش اخلاقی سے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا۔ حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت میرے چہرے سے عیاں تھی چونکہ ہمارے یہاں خوش اخلاقی پر لیکچر تو دیئے جاتے ہیں لیکن عملی مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔ وہ خوش مزاج خاتون وہاں کی ماہر نفسیات تھیں جو شائد مجھے ہمارسمجھ کر مسیحائی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ممکن ہے انہوں نے یہی سمجھا ہو کہ میں نئی ہاؤس ممبر ہوں۔

وہاں ہاؤس ممبرز کام میں مصروف تھے۔ کاغذ کے پھول بنا رہے تھے ۔۔ کچھ میٹل ورک کر رہے تھے ۔۔ وہ سب اپنے فن کے ماہر نظر آ رہے تھے۔ کچھ چیزیں مکمل صورت میں ہمارے سامنے تھیں اور کچھ تکمیل کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔ میں نے ان کا شوروم بھی دیکھا اور سوچا

کہ اِس ہنر کا انہیں کیا فائدہ ــــ؟

میں سوچ میں مصروف تھی کہ ایک مترنم آواز نے میری سماعتوں میں رس گھولا۔

کیا آپ اخبار کے دفتر سے آئی ہیں؟

جی ہاں ــــ۔

اگر آپ کے پاس وقت ہو تو ہماری موسیقی کی کلاس اٹینڈ کر لیجئے۔ اس کے بعد بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ آپ ان لوگوں کا مشاہدہ بھی کر لیجئے گا ــــ ان سے اسی دوران دوستی بھی ہو جائے گی ــــ پھر ان سے بات چیت میں آسانی ہو جائے گی۔ آپ ان کے لیے اجنبی نہیں رہیں گی ــــ ٹھیک ہے ــــ؟

ظاہر ہے اتنی پر خلوص پیشکش کو ٹھکرانا ناممکن تھا۔ یوں بھی موسیقی سے مجھے گہرا لگاؤ ہے۔ سُر تال سے دوری میرے بس کی بات نہیں۔

ماسٹر صاحب ہارمونیم پہ کوئی دُھن بجا رہے تھے۔ ان کے ساتھ طبلے پر ایک نوجوان سنگت کر رہا تھا۔ معلوم ہوا وہ بھی ہاؤس ممبر ہے۔

ماسٹر صاحب کی آواز ہارمونیم کی لے کے ساتھ ابھری۔

کلاس میں اُداس چہروں کی محفل سجی تھی۔ سب اپنے اپنے سوگ میں بیٹھے تھے۔ پتہ نہیں انہیں کیا کیا روگ ہوں گے؟ سب لوگ اپنے اپنے سوگ میں بیٹھے تھے۔ کیسے کیسے صدمے ان کے دِلوں نے سہے ہوں گے۔ جبھی تو آج یہ اس حال میں ہیں۔

طبلے کی تھاپ ہارمونیم کے سُر اور آواز کے جادو نے بھی ان لوگوں کو متاثر نہیں کیا ــــ یوں لگتا تھا جیسے انہیں کسی اور کی تلاش ہو ــــ کسی اور ہی دُنیا کو کھوجنا چاہتے ہیں ــــ ان کی نظریں جس نظارے کی متمنی ہیں وہ یہاں نہیں ہے ــــ کہیں اور ہے۔ شائد وہ اس کہیں اور کے بارے میں بھی وہ کچھ نہیں جانتے ــــ شائد راستوں کی بھی انہیں خبر نہیں ہے ــــ بس وہ سفر کئے

جا رہے ہیں ــــ نہ ختم ہونے والا سفر ــــ کسی کو علم نہیں کہ کس مقام پہ منزل آ جائے۔ کون سا سراب حقیقت بن جائے اور کونسی حقیقت سراب ہو ــــ کوئی بھی کسی چیز کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا ــــ میری سوچ کو راستے ہی سے لوٹنا پڑا۔

آپ گیت سنائیے نا ــــ؟

میرا موڈ نہیں ہے ــــ اکتائے اکتائے لہجے میں جواب ملا۔

آپ کا موڈ تو کبھی نہیں ہوا ــــ خود ہی شکوہ کرتے ہیں کہ چانس نہیں ملا ــــ جب ہم چانس دیتے ہیں تو آپ قیمتی وقت گنوا دیتے ہیں۔

ماسٹر جی کے لہجے میں شکوہ بھی تھا اور تلخی کی کچھ بوندیں بھی ــــ۔

چانس دینے سے میرا مطلب تھا کہ اور لوگ بھی گائیں ــــ دوسروں کی بھی حوصلہ افزائی ہو۔

پہلے آپ تو سنائیں ــــ یہاں اور کسے گانا آتا ہے ــــ؟ طنز کا تیر خاموشی سے چل گیا اور میں سوچنے لگی ــــ کیا ان لوگوں کے دل ٹوٹنے کے لیے ہی ہوتے ہیں ــــ ان کے احساسات اور جذبات کی دوسروں کو پرواہ کیوں نہیں ہوتی؟ ان کے لبوں پر تو مستقل خاموشی ہے ــــ کیا اس در کو کوئی نہیں کھولے گا۔ ان کے حرف کی، بیان کی اظہار کی قوت کو تحریک کون دے گا؟ ان کو اذنِ کلام کون دے گا؟۔

میرے سوالوں کو صرف خاموشی نے جواب دیا اور پھر وہ جانے کہاں سمھو گئی؟ یکیش کے لہجے میں کانپتی آواز میں کون کہہ رہا تھا۔

جانے کہاں گئے وہ دن

بے ترتیب سانسوں میں حسرت سسک رہی تھی۔ یہ دن کہاں جا چھپے ــــ کیا کوئی بھی انہیں دوبارہ واپس نہیں لا سکتا۔ آخر کیوں ــــ۔ زندگی میں اتنا بہت کچھ کیسے گم جاتا ہے ــــ کیسے چیزیں ہم سے دُور ہو جاتی ہیں ــــ کیسے وقت کھو جاتا ہے ــــ؟

اسی کھوئے وقت اور دُور ہوئی چیزوں میں جاوید منصور بھی ہے — وہی جاوید جس کے نام کی پُکار میں کئی آوازیں شریک ہیں۔ میں بھی لاشعوری طور پر اس شخص کا انتظار کرنے لگی تھی۔ ہر نئے چہرے کو جاوید سمجھنے لگی تھی

پھر وہ آگیا — ایک خوش شکل نوجوان۔ جس سے لوگ فرمائش کر رہے تھے — کبھی لفظوں کے سہاروں سے کبھی نظروں کے اشاروں سے۔ ہاؤس ممبرز کے چہروں پہ اس کے آنے سے ایک زندگی سی آگئی تھی — ان کی آنکھوں میں روشنی کی جھلک میں نے دیکھی تھی اور اُن کے جذبوں کو سمجھنا میرے لیے قطعی طور پہ ناممکن نہیں تھا۔

میں اس آواز کو اس لہجے کو کیا نام دوں؟ کیا کوئی اور اتنے ہی جذبے سے — اتنی ہی شدت سے اتنی ہی پرسوز آواز سے یہی کہہ پائے گا — ان لفظوں کا مفہوم واضح کر پائے گا — اُس نے تو لفظوں کو اس طرح ادا کیا کہ معنی سمجھ میں آگئے۔

میں اپنے آپ سے گھبرا گیا ہوں
مجھے اے زندگی تو دیوانہ کر دے

میں اس آواز کے دُکھ میں شریک تھی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی میری آواز میں میرے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہو — لیکن وہ آواز کسی اور کی تھی — وہ جاوید تھا — گیت ختم ہوا تو جیسے تالیوں نے ایک بار پھر کی صدا بلند کی۔

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ میری نظروں سے بہت دُور چلا گیا — اس کے جانے کے بعد سناٹا چھا گیا تھا — میری نگاہیں اسی راستے پہ جمی تھیں — جاوید لوٹا تو اُس کے ہاتھ میں ڈفلی تھی — طبلے پہ تھاپ پڑی — سُر جاگے اور ڈفلی کی آواز گونجی — جاوید کا ایک نیا روپ سامنے آیا — وہ پھر چھا گیا تھا۔

ڈفلی والے — ڈفلی بجا
میرے گھنگھرو بلاتے ہیں آ
میں ناچوں تو نچا — !

جیسے یہ جاوید کے اپنے دل کی صدا ہو — پھر آوازوں اور چہروں کا اصرار بڑھا اور جاوید کی آواز نے گیت دُھرا دیا۔

اے دنیا کے رکھوالے
سن درد بھرے میرے نالے

مہمول کی سوگواری کچھ دیر بعد کسی حد تک کم ہوئی — کوئی زمین کی گھاس کو پیروں تلے مسل رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ سُر تال کا ساتھ دیتے دیتے تھک گئے تھے — کسی کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھرتے بکھرتے رہ گئی — کسی کی نظریں آسمان کو دیکھ رہی تھیں کہ کب اس کی رحمت نازل ہو گی؟ کب اس کے حُکم سے ہم اذیت سے نجات حاصل کریں گے — نئی دنیا میں سانس لیں گے۔ شائد کبھی کہیں جی کو سُکھ مل جائے۔ آس کا دیپ جلا رہے تو بہتر ورنہ اس کٹھن جیون کو جینا آسان نہیں۔ سہل تو کچھ بھی نہیں ہوتا — ہر مشکل کو آسان بنانا پڑتا ہے مگر اس کے لیے بھی دشواریاں جھیلنا پڑتی ہیں اور جانے کس کس بُھلیکے کا شکار ہونا پڑتا ہے — انہی بُھلیکوں کی بات جاوید بھی کر رہا تھا۔

پیار دے بُھلیکے کتنے سوہنے سوہنے کھا گئے

جب کوئی کسی سے پیار کرتا ہے تو اسے دُنیا کی طرف دیکھنے کی فرصت بھی نہیں ملتی بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ خواہش نہیں رہتی۔ لیکن جب کبھی بھولے سے دُنیا کا خیال آتا ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ جو لوگ اِس بُھلیکے کا شکار نہیں ہوئے وہ دوسرے کئی بُھلیکے کھا بیٹھے ہیں۔ اور وہ سب کتنے خوش قسمت ہیں کہ محبت کے بُھلیکے میں نہیں پڑے۔ اِس میں تو انسان چکرا کے رہ جاتا ہے اور چکروں کا ایک سلسلہ سا چل نکلتا ہے — ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ۔

کڑی سے کڑی ملتی ہے تو زنجیر بن جاتی ہے ۔ آپ اس قید سے رہائی حاصل نہیں کر سکتے۔
محبت کے جذبے کی شدت تو پتھر دلوں کو موم کر دیتی ہے ۔ محبت میں چند خوش بختوں کو
کامیابی بھی ہوتی ہے ۔ لیکن ان چند کو چھوڑ کر بیشتر کو ناکامی ہی ہوتی ہے ۔ ناکامی کی صورت
میں منفی سوچ غالب آجاتی ہے ۔ کچھ لوگ موت کا چہرہ دیکھنے میں اور کچھ لوگوں کو وقت اس
راستے پر لے آتا ہے یہاں سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہوتی ۔ یہ جگہ جہاں مینٹل ہاسپٹل
یا فاؤنٹین ہاؤس کا بورڈ لکھا ہوتا ہے ۔۔۔

ہم لوگوں نے ہی انہیں خوشیوں اور محبتوں سے محروم کر کے اس حالت تک پہنچایا ہے۔
اور اب ہم ان کے لیے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے ۔ مرجھائے ہوئے چہروں سے شکوے کا
رنگ جھلکتا ہے مگر وہ کس سے شکوہ کریں ؟ اس قفس سے اڑنے کو سبھی تیار ہیں مگر کہاں
جائیں ؟ پھر جانے بھی کون دے گا ؟ اس ماحول میں رہنے والوں پہ حیرت ، کرب اور
خوف کے سائے کیوں لرزاں تھے یہ ہم نہیں جان سکے ۔ ہم ایک دوسرے کو بے بسی
سے دیکھتے تھے ۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں صبر اور حوصلے کا پیغام دیتے ۔ ہم صرف ان کی
حالت کو دیکھ رہے تھے اور جو اس حالت سے گزر رہے تھے وہ ۔۔۔ ؟

اس سے آگے میں کچھ نہیں سوچ سکی ۔ چند لمحے انہیں مسکراہٹیں اور محبتیں دے کر ہمیں
اس دروازے سے باہر لوٹ آنا تھا ۔ جہاں ایک نئی زندگی ہے ۔ زندگی کی حرارتیں اور
تمازتیں ہماری منتظر ہیں جو دُنیا ان کے لیے اجنبی ہے اک سراب ہے ۔ اک ان چھوٹی کلی
ہے اک سراب ہے ۔ اس حیات کی شاہراہ ان پھیکی رنگتوں کے لیے ، ان اجڑائے
چہروں کے لیے ، ان ٹوٹے لہجوں اور مدہم آوازوں کے لیے بند ہے ۔ ابھی یہ ان سرحدوں
کو عبور نہیں کر سکتے ۔ معاشرہ اس کی اجازت نہیں دیتا ۔ میں ان کی مونس و غم خوار نہیں
بن سکتی ۔ وہاں سب لوگ ہم سے گیت سُننے کی فرمائش کرتے ہیں اور ہم سب کی
آواز ہمارا ساتھ نہیں دیتی ۔ شائد وہ ہمارے جذبوں کا اظہار چاہتے ہیں ۔ ہمارے

لبوں کا انکار ان کی خواہش کے پر کاٹ دیتا ہے مگر اس سے خواہش پرواز تو ختم نہیں
ہوتی ۔

جاوید کی پُرسوز آواز نے سُروں میں اضطراب پیدا کیا اور ہمارے سوئے ہوئے
درد بھی جاگ اُٹھے ۔ کہانی گیت سنگیت سے شروع ہوتی ہے اور اپنی سر تال کے
سنگم پہ ختم ہوتی ہے ۔ گیت گاتے ہوئے وہ بہت دور چلا جاتا ہے ۔ شائد سپنوں
کی وادی میں ۔ شائد اپنی من چاہی دنیا میں جہاں سب کچھ ویسا تھا جیسا وہ چاہتا تھا ۔

جاوید منصور سے بہت سی باتیں کرنے کو جی چاہا ۔ اس کا اظہار ان کی انسٹرکٹر سے
کیا تو وہ بخوشی راضی ہو گئیں ۔

جاوید اخبار کے دفتر سے آئے ہیں ۔ تمہارا انٹرویو لیں گے ۔

"میرا ۔ ؟ حیرت اور مسرت کا خوشگوار احساس اس کے چہرے سے جھلک رہا تھا ۔ ہم لوگ
کچھ کہنے سُننے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہے تھے ۔ ان کے ایک بنچ پہ خاتون
انسٹرکٹر نے ہمیں بیٹھنے کی پیشکش کی تو جاوید نے فوراً انکار کر دیا ۔

یہاں نہیں بیٹھتا ۔ دیکھیں تو کتنا گندا ہے ۔ چڑیوں نے ۔۔۔

بالآخر ہمارے لیے کرسیاں منگوائی گئیں اور ہم گھاس پہ سبھا جمانے کی بجائے کرسیوں
پہ بیٹھے گفتگو کرنے لگے ۔

جاوید انسٹرکٹر کے سامنے کھُل کر بات نہیں کر رہا تھا ۔ سو اس کے
ساتھ انسٹرکٹر کے ساتھ اور اس کے بغیر کئی ملاقاتیں ہوئیں ۔ وہ سب کچھ تو نہیں مگر
بہت کچھ بتانے میں ضرور کامیاب ہوا ۔

جاوید تم یہاں تک کیسے آئے ؟

مجھے دُنیا سے جدا ہوئے اور خود سے گھبرائے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے ۔
۱۹۶۹ء کی بات ہے ۔ میں بھی ایک نارمل انسان تھا ۔ ہیلی کالج آف کامرس میں تھرڈ ایئر کا

کا طالب علم تھا۔ پتہ ہے میں نے کالج میں داخلہ کیوں لیا تھا؟ اسی گانے کے شوق میں سوچا تھا کہ کالج جاکر اپنا فن آزماؤں گا۔ میرا یہ ہنر میرے کام آئے گا۔ شائد کوئی میرے فن کی قدر کرے۔ ہو سکتا ہے ٹیلیویژن پر ہی موقعہ مل جائے ——

بھولے انسان تم اس دیس کو کیا جانو گے؟ یہاں کے اپنے دُکھ اپنے دستور ہیں —— دُور سے ہر منظر سہانا لگتا ہے —— یہاں صرف چمکتی روشنیاں ہیں —— دل اور چہرے نہیں —— یہاں بھی منافقت، جھوٹ اور تعلقات کی جیت ہوتی ہے۔ دیکھنے میں سونا جیسے لوگ بھی ہیں مگر یہ سب نظر کا دھوکہ ہے —— اور کچھ نہیں!

لیکن میرے تو خواب بکھر گئے۔ ضروری تو نہیں کہ ہر خواب کی تعبیر بھی اچھی ہو۔ میرے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کسی نے نہیں دیکھی۔ میں دن رات خود سے جنگ کرتا رہا —— ہارتا رہا —— میرے اندر کا حساس فنکار ہر شکست پہ آنسو بہاتا لیکن میرے درد کو کوئی بھی نہ جان سکا۔ کسی کو میری فکر ہی نہیں تھی۔ میرے جنون سے کوئی واقف نہیں تھا۔ موسیقی کی طرف میرا رجحان شروع سے تھا۔ لیکن اس شوق کو بڑھانے میں میرے پڑوسیوں کا بھی ہاتھ ہے۔ ہمارے محلے میں میر حسینی اور سائیس اختر حسین رہا کرتے تھے —— یہ ان کی محبت کا اثر تھا اور کچھ دوستوں کی حوصلہ افزائی جس نے مجھے آگے بڑھنے میں مدد دی۔

گھر والوں نے میرے اس جنون کی سزا یہ دی کہ مجھے کالج سے اٹھوا دیا —— جس طرح لڑکیوں کی محبت کا راز افشا ہونے پر انہیں سکول کالج سے اٹھوا لیا جاتا ہے —— مجھے تو ایسا لگا جیسے کوئی زبردست آندھی آئی اور درخت کو اس کی جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک گئی ہو۔ اس کے بعد میں کچھ بھی نہیں کر سکا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟ لیکن یہی ایک وجہ نہیں ہے میری دیوانگی کی —— جاوید نے صاف گوئی سے بتایا ——

ہاں جاوید بہت سے اسباب نے مل کر تمہارے خلاف سازش کی ہوگی —— ایک ایک زہر کی بوند یکجا ہو کر زہر پیالہ بن جایا کرتی ہے —— سقراط نے تو صرف سچ بولنے پر زہر کا پیالہ پیا تھا لیکن اس کے بعد لاکھوں انسانوں نے کسی نہ کسی جرم کی پاداش میں نظر نہ آنے والے زہر کے پیالے پیئے اور جانے کب تک لوگ پیتے رہیں گے۔

پھر میں ان لوگوں سے دُور ہو گیا —— ان کی سوچ نے میری الجھنوں کا ایک ہی حل تلاش کیا —— مجھے دماغی امراض کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ لیکن اس حالت کے باوجود میں ان اپنوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکا۔ ہمارے خاندان میں بظاہر مسیحاؤں (ڈاکٹروں) کی تعداد خاصی تھی —— لیکن میرے لیے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ کسی کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ رحم نہیں تھا۔ بس دکھاوے کا ترس تھا —— مجھے ان سب لوگوں کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا —— جب وہ میرے پاس نہیں تھے۔ میرے قریب نہیں تھے —— وہ سب جو میرے اپنے تھے لیکن اجنبی تھے۔ اس سزا کی وجہ صرف میرے گانے کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ "وہ" بھی تھے —— "وہ"، جس کا ذکر کرتے ہوئے جاوید کی آنکھوں میں نئی چمک، نئی روشنی پیدا ہوئی۔ وہی چمک جو اندھیرے میں اُجالے کی ایک کرن دیکھ کر آنکھوں میں مسرت پیدا کرتی ہے۔ زندگی کا پیغام دیتی ہے۔ ناامیدی کے دُھند چھٹ جاتی ہے اور اُس کا سورج روشن ہو جاتا ہے ——

وہ کون تھی؟

وہ میری اپنی تھی —— اگر میں اس کا قرب پا لیتا تو شائد میرا جیون سنور جاتا۔ اگر وہ مل جاتی تو آج میں اس مقام پر نہ ہوتا۔ اس کی آواز آج بھی میری سماعتوں میں رس گھولتی ہے۔ اس کا وجود اتنا ہی پُرکشش نظر آتا ہے جتنا برسوں پہلے تھا۔ میں تو اس سے صرف دو تین مرتبہ ملا تھا۔ مگر یہی مختصر اور چند لمحوں کی ملاقاتیں میری زندگی کو اس موڑ پر لے آئیں۔

میں جس کے لیے اپنی زندگی اپنا شعور اپنا آپ کھو بیٹھا ہوں ـــ وہ تو انار کی کلی کی طرح تھی ـــ بہت ہی خوبصورت پھول کی خوشبو کی طرح ـــ اتنی کومل، اتنی معصوم اتنی پاکیزہ جیسے موتیے کا پھول۔

صبیحہ خانم کی عہدِ شباب کی فلمیں آپ نے دیکھی ہیں؟

میں نے اس کی ہر فلم کئی کئی مرتبہ دیکھی ـــ صبیحہ خانم میں اس کا جھلک نظر آتی تھی۔ وہ بھی اتنی ہی خوبصورت تھی۔ اتنا حسن بھی تو خدا کسی کسی کو دیتا ہے ـــ یہ لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں ـــ یہ تو رب کا روپ ہوتے ہیں۔ حسن اور دلکشی کے جتنے بھی نظارے ہیں سب اسی کا پرتو ہیں ـــ ہر حسین اور خوبصورت نقش اسی کا تخلیق کردہ ہے۔ لیکن ان ظالم لوگوں سے میری یہ خوشی اور خواہش نہ دیکھی گئی ـــ پتہ نہیں مجھ سے کیوں بیر ہے سب کو؟ مجھ سے وہ دُور کردی گئی ـــ کوئی اپنے آپ سے جُدا ہو کر بھی زندہ رہ سکتا ہے؟ مگر میں زندہ رہا ـــ لیکن یہ بھی کوئی زندگی ہے ـــ اسے کون زندگی کہہ سکتا ہے؟

پیار کرنے والے بدنام کیوں ہو جاتے ہیں؟

جاوید نے معصومیت سے سوال کیا۔

اس لیے کہ ہم سبھی لوگ بہت کم ظرف ہیں ـــ اپنی محرومیوں کا بدلہ دوسروں سے لیتے ہیں۔ سوچتے ہیں اگر ہمارے نصیب میں خوشیاں نہیں آئیں تو وہ دوسروں کو کیوں ملیں؟ ہم انتہائی خود غرض ہو جاتے ہیں ـــ بلکہ ہم کمینے بن جاتے ہیں ـــ لیکن اس کمینے پن کو بھی ہم اپنی اداکاری کی وجہ سے لفظوں میں چھپا کر استعمال کرتے ہیں۔ تاکہ کوئی ہمارا اصل نہ جان سکے ـــ ہمارا چہرہ نہ پہچان سکے ـــ ہم سچ سے خوفزدہ ہیں۔ سچائی بہت تلخ اور برہنہ ہوتی ہے اور ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔

باجی! لوگ سمجھتے ہیں کہ پیار کرنے والے اس معاشرے کے چور ہیں ـــ محبت کوئی چوری یا ڈاکہ تو نہیں ہے۔ یہ تو ہم سب انسانوں کا بنیادی حق ہے۔ اپنا حق لینا تو چوری نہیں ـــ

کسی کو چاہنا، کسی کی خواہش کرنا کوئی جُرم تو نہیں۔ پھر ہمیں ایسی اذیت ایسی سزا کیوں ملتی ہے؟ ہمیں چور کیوں سمجھا جاتا ہے؟

اس لیے جاوید کہ آج چوری اور ڈاکہ کرنے والوں کو کوئی گرفتار نہیں کرتا۔ اور سچے جذبوں کے اظہار کی ہمیں اجازت نہیں۔ یہ سب نادان ہیں۔ جُرم خود کرتے ہیں الزام دوسروں کو دیتے ہیں۔ ظلم تو یہ لوگ ہم پر کرتے ہیں مگر علم نہیں رکھتے۔ اگر علم ہو بھی جائے تو اعتراف نہیں کرتے۔ ہماری لغت میں اعتراف کا لفظ ہی نہیں ہے یہ جاہل لوگ اس پریت کے بندھن کو کیا جانیں؟ یہ خود اس نعمت سے محروم رہے ہیں اسی لیے دوسروں کو دُکھ دیتے ہیں اور پھر اتہا کر دیتے ہیں کہ وہ شخص اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں ہوش نہیں رہتا۔

یہ ہوش والے دوسروں کو دیوانہ بنا دیتے ہیں ـــ تم بھی اسی لیے آج دیوانے کہلاتے ہو ـــ۔

جاوید ـــ کیا تم اسی کے لیے گیت نہیں گاتے؟

ہاں ـــ میں اسی کی زندگی کے لیے گیت گاتا ہوں۔ اسی کی سلامتی کے لیے دُعا مانگتا ہوں۔ میرا یقین ہے میری آواز اس تک ضرور پہنچتی ہوگی۔ چاہے میں ان دیواروں میں ہوں یا کسی تنگ و تاریک کمرے میں ـــ میری آواز در و دیوار توڑ کر اس کے کانوں میں اس کے دل میں گونجے گی۔ آج وہ کہیں بھی ہو۔ اسے میرا خیال ضرور آتا ہوگا اور میری آواز کی بازگشت وہ ضرور سنتی ہوگی۔ ضرور!

جاوید کبھی تم نے اپنی زندگی کے بارے میں سوچا ـــ؟

میری زندگی ـــ؟ میری اپنی زندگی مجھے ملی ہی کب ہے؟ میں تو کربِ مسلسل میں مبتلا ہوں ـــ جانے کب تک یہ تنہائیاں میری ہم سفر رہیں گی ـــ؟

یہ ہر گھڑی کا عذاب میں کب تک سہوں گا؟ اب کیا سوچوں ــــ؟ اس طویل اور صبر آزما مرحلے سے میں گھبرا گیا ہوں ــــ بہت زیادہ تھک گیا ہوں ــــ اب تو تھکن جیسا لفظ بھی میری تھکن کو ظاہر نہیں کر سکتا ــــ میں تھکتے تھکتے بھی تھک گیا ہوں۔

کوئی سہارا تلاش کر لو ــــ شادی کے متعلق کیا کہو گے؟

شادی ــــ اب نہیں ہو سکتی ــــ جب ساری عمر تباہ ہو جائے ــــ گزر جائے تو شادی؟

کیا تم اس ماحول کے عادی ہو گئے ہو؟

اس ماحول کا عادی ہونا پڑتا ہے۔ چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ــــ لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ لوگوں کا ہجوم ہر جگہ ہوتا ہے لیکن ان لوگوں میں ہر شخص اپنا نہیں ہوتا۔ بلکہ کوئی بھی شخص اپنا نہیں ہوتا۔ پہلے گھر والے بہت یاد آتے ہیں۔ جب تک میری شفیق والدہ حیات تھیں تب تک وہاں کے در و دیوار مجھ سے پیار کرتے تھے۔ مجھے گھر کا سکون اور آسائش ہوتا تھا۔ لیکن اب وہاں میرے غم میں گھلنے والا کوئی نہیں ہے ــــ بہنیں اپنے گھروں میں آباد ہیں ــــ بھائیوں کے اپنے مسائل ہیں ــــ کسی کو میرا خیال نہیں۔ میری ضرورت نہیں۔ وہ لوگ مجھ سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ جانے کب کیا کر بیٹھوں؟ میری حیثیت ان کے لیے ایک بیکار پرزے سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں تو ان کے لیے ایک مریض ہوں۔ پھر یہاں رہتے ہوئے یہاں کے اصول و ضوابط کی پابندی بھی کرنا پڑتی ہے۔ ہمیں اس صدر دروازے سے باہر جانے کی قطعی اجازت نہیں ہے۔ سچ کیوں تو اتنی جرأت بھی نہیں ہے ــــ اگر ہمت کر لوں تو کڑی سزا

ملے گی۔ جانتے ہوئے آگ میں کودنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ یہ لوگ بھی میری طرف سے بہت محتاط رہتے ہیں ــــ ایک مرتبہ میں اس چار دیواری سے فرار ہو چکا ہوں۔ تبھی تو سب مجھ پر نگاہ رکھتے ہیں۔ مجھے باہر والوں سے زیادہ بے تکلف ہونے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ میں سچ بولتا ہوں نا اسی لیے مجھ سے ڈرتے ہیں ــــ بزدل کہیں کے!

کیسا تجربہ تھا ــــ باہر کے ماحول میں کیا تبدیلی دیکھی ــــ؟

میں نے بہت کچھ دیکھا۔ منافقت اور جھوٹ کے بغیر تو اس دنیا میں گزارا ہی نہیں۔ میں نے بھی خود کو اس رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ نوکری کے لیے درخواستیں دیں، انٹرویو دیئے لیکن کسی نے میری مدد نہیں کی بلکہ سب نے میرے راستے میں دیواریں کھڑی کیں۔ مجھے ایک عام شخص کی حیثیت سے قبول نہیں کیا گیا۔ کسی نے بھی نارمل انسان نہیں سمجھا ــــ مجھے واپس اسی دروازے سے اندر آنا پڑا ــــ کیا کرتا ــــ مجبور تھا۔

جاوید ــــ کیا تم نے موسیقی کی باقاعدہ ترتیب حاصل کی ہے۔

نہیں ــــ انسان اپنا استاد خود ہوتا ہے ــــ پھر کوئی میری مدد کیوں کرتا؟ استاد کو معاوضہ کہاں سے دوں گا ــــ میں تو ایک بے روزگار انسان ہوں۔ اپنے ضروری اخراجات تو پورے نہیں کر سکتا یہ خرچ کیسے برداشت کروں گا؟

فاؤنٹین ہاؤس میں رہتے ہوئے کوئی ہنر بھی سیکھا؟

ہاں ــــ پھول بنانے سیکھے ہیں ــــ ٹائپ بھی آتی ہے ــــ لیکن میرا اصل ہنر تو میری آواز ہے۔ یہی میرا قیمتی سرمایہ ہے ــــ اسی شوق کے ہاتھوں میں دیوانہ ہوا ــــ جہاں ا[illegible] نے سہارا دیا وہیں یہ میری رسوائی کا

کا سبب بھی بنا۔ تمام باتوں کے باوجود میں سُر سے اپنا ناتا نہیں توڑ سکتا۔ جب تک سانس چلتی رہے گی میرے گیتوں کی ناؤ بہتی رہے گی۔ لگتا ہے صرف آواز لے کر اس دنیا میں آیا ہوں ٹوٹے دل کی آوازیں بھی پُرتاثیر ہوتی ہے۔ یہاں تو لوگ میرے گیت توجہ سے سُنتے ہیں۔ میرے گیت کو گیت بھی سمجھ کر سُنتے ہیں لیکن مینٹل ہسپتال میں میرے گیتوں کو میرے علاج میں معاون سمجھا جاتا ہے۔ وہ میرے ہر لفظ کا پس منظر تلاش کرنے لگتے ہیں — یہ بات مجھے ناپسند تھی۔

جاوید تمہارے گھر والے تمہیں کس انداز سے ملتے ہیں — کیا تاثر ہوتا ہے؟

بہت اجنبیت — جیسے ملنے کی مجبوری ہو — اتنے فاصلوں سے ملنا مجھے پسند نہیں۔ ٹھیک ہے میں اپنی ذہنی الجھنوں کو ختم کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ میں کسی چھوت کی بیماری میں مبتلا ہوں۔ مجھے اس مقام پر پہنچانے میں تو اپنے پرائے سبھی شامل ہیں — سب قصوروار ہیں — کیا میری اس زندگی میں ان سب کا کوئی حصہ نہیں — ذہنی مریض ہوتے ہوئے صرف میں اکیلا قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ جب یہ لوگ مجھے اجنبیوں کی طرح ملتے ہیں تو مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ ایسی ملاقات سے مجھے بہت تکلیف ہوتی — میں زیادہ پریشان ہو جاتا ہوں — میرے ابھی تک صحت یاب نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم ملیں بھی نہیں۔ مجھے کوئی نہ آئے — لیکن یہ بات بھی میں انہیں نہیں کہہ سکتا — جیسے اور کئی باتیں ان کہی رہ گئی ہیں — کئی خواب ادھورے رہ گئے ہیں میں سب سے چھوٹا ہوں اسی لیے ہمیشہ میری باری آنے پر

چیزیں ختم ہو جاتی ہیں — میرے لیے کچھ بھی باقی نہیں بچتا — میں اس بات پر بہت اُداس ہوتا ہوں۔ افسردہ ہوتا ہوں — لیکن میرے دُکھ میری اُداسی سے کسی کو کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ سب تو خوش ہیں نا — انہیں مجھ سے کیا —؟

جاوید ہم نے تو ہمیشہ یہی سُنا ہے کہ چھوٹے بہت لاڈلے ہوتے ہیں؟

پھر آپ نے وہ گیت نہیں سُنا ہوگا — میں سُناتا ہوں

انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند
کیسی انوکھی بات رے
تن کے گھاؤ تو بھر گئے داتا
من کا گھاؤ نہیں بھر پاتا
جی کا حال سمجھ نہیں آتا
کیسی انوکھی بات رے

جس پہ نہ بیتے وہ کب جانے
جگ والے سمجھانے
پاگل دن کوئی بات نہ مانے
کیسی انوکھی بات رے
انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند

جاوید موسیقی سے تو تمہیں گہرا لگاؤ ہے کیا ادب سے بھی ہے؟

ہاں ــــ صرف شاعری کی حد تک ۔ اچھی غزل ہو نظم یا گیت میں اسے سُروں کے مضبوط بندھن میں باندھ سکتا ہوں ــــ میں ان کی دُھن با آسانی بنا سکتا ہوں ۔ لیکن کتابیں پڑھنا بہت مشکل کام ہے ۔ میں ان سے دُور ہی رہا ہوں ــــ دراصل مجھے اتنے بہت سے انسان پڑھنے کو ملے ہیں کہ میں پڑھائی سے دُور چلا گیا ہوں ۔ پڑھنا اچھا نہیں لگتا ۔ صرف گیت گانا اچھا لگتا ہے ــــ میں اس معاملے میں تو خود مختار ہوں ۔ جب چاہوں ۔ جو چاہوں ــــ گا سکتا ہوں ۔ یہی میری زندگی ہے ــــ ۔

جاوید جب تم اس زندگی سے دوسری زندگی میں قدم رکھو گے تب کیا کرو گے ۔ واپس جا کر کیا کرو گے ؟

یہاں سے واپس گیا تو کچھ کروں گا ــــ ساری زندگی تو مینٹل اسپتال اور فاؤنٹین ہاؤس کی نذر ہو گئی ــــ نہ علم حاصل کر سکا ــــ نہ ہی اور کوئی کام سیکھ سکا ۔ لیکن زندہ رہنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے ــــ ایک مقصدِ حیات تھا جسے حاصل کرنے کی تگ و دو کی مگر افسوس ... یہ سفر رائیگاں ہی گیا ۔ کوشش کروں گا کہ ریڈیو ــــ ٹی وی جیسے اداروں سے منسلک ہو جاؤں ۔ نجی محفلوں میں بھی اپنی آواز کا بہتر استعمال کر سکتا ہوں ۔ یہاں پہ آنے والے لوگ بھی میرا گانا سُن کر بہت خوش ہوتے ہیں ــــ وہ لوگ بھی تو دعوتوں میں بلائیں گے نا ــــ ؟

جاوید ریڈیو ــــ ٹیلیویژن پہ آپ مکمل انحصار نہیں کر سکتے ــــ یہاں نام ہی نام ہے ــــ معاوضے بہت کم ہیں ــــ تمہاری سوچ اور توقع سے کہیں زیادہ کم ــــ اور رہی لوگوں کی بات تو جب تک ان لوگوں سے کام نہ پڑے ، واسطہ نہ پڑے یہ سب بہت اچھے مخلص اور ہمدرد دکھائی دیتے ہیں ــــ کام کے وقت پہ تمام لوگ نگاہیں اور چہرے بدل لیتے ہیں ــــ پہنچانتے بھی

نہیں ــــ پھر کیا کرو گے ؟

ہو سکتا ہے کوئی ایسا گروپ بنا لوں جو مختلف جگہوں پہ گیت سنگیت کی محفل سجا سکے ۔ روزگار کا ایک یہ بھی ذریعہ بن سکتا ہے ۔ اپنا ادارہ بنایا جا سکتا ہے ۔

اس کے لیے بھی سرمائے کی ضرورت ہو گی ۔

چھوڑیں ــــ جب اس دروازے سے باہر جائیں گے تو سوچیں گے ۔ ابھی سے سوچ سوچ کر کیوں خود کو پریشان کیا جائے ــــ ویسے پریشانیاں کم ہیں کیا ــــ ؟ میں تو یوں بھی اب پریشانی سے تنگ آ گیا ہوں ۔ سمجھ میں نہیں آتا ــــ کیا کروں ؟ چلو اتنی زندگی گزر گئی ہے ــــ جو رہ گئی ہے وہ بھی گزر ہی جائے گی ۔ جب قسمت میں محتاجی لکھی ہے ــــ دُکھ لکھے ہیں تو لکھے کو کون مٹائے ــــ ؟

وہ خود ہی انصاف کرے گا ۔ اسے بھی تو پتہ ہے کہ اُس نے ہمیں دُنیا میں بھیجا ہے ۔ کیا پتہ ہم نے کوئی غلطیاں کی ہوں جن کی وہ سزا دے رہا ہے ۔ لیکن یہ سزا تو بہت زیادہ ہے ــــ تھوڑی کم ہونی چاہیئے تھی ــــ ہے نا ــــ ؟

یہ جاوید منصور جو میری طرح سوچتا ہے اور میری طرح بیچ بولتا ہے اس ہوشمند کو دیوانہ کیسے کیا جا سکتا ہے ؟ لیکن وہاں موجود سٹاف ممبرز جو خود کو عاقل جانتے ہیں ان کے مطابق جاوید بیمار ہے ــــ وہ ایک ایسے مرض کا شکار ہے جسے "شیزو فرینیا" کہا جاتا ہے ۔ اور اس مرض میں ہر پانچواں شخص مبتلا ہے ۔ جاوید کے معالج یہ بھی ہیں کہ جتنی مدت اس مرض نے اپنا آپ ظاہر کرنے میں گزاری ہے اتنی ہی مدت اس کے اثرات زائل کرنے میں لگے گی ۔

شیزوفیرینیا دراصل بکھری ہوئی شخصیت کا مرض ہے۔ اس میں انسان منفی سوچ اپنا لیتا ہے اور مثبت رویّوں کو رد کر دیتا ہے پہلے لوگوں سے رابطہ ٹوٹتا ہے اور پھر اپنی شخصیت بھی پرائی لگتی ہے ــــ انسان شکست و ریخت کے مرحلے سے گزرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ بہت زیادہ ردِّ عمل کا اظہار کرتا ہے اور کبھی کوئی بھی تاثر نہیں ہوتا ۔ مریض خود میں کہیں کھو جاتا ہے وہ اتنی دور نکل جاتا ہے کہ اس کے لیے خود کو تلاش کرنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ وہ اپنی الجھنوں میں پھنس کے رہ جاتا ہے وہ خود بھی اپنے عمل اور ردِّ عمل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے ۔ ایسی صورت میں معالج کی ضرورت ہے ۔ مریض کی صحت یابی کے لیے مریض اور معالج دونوں کا تعاون ضروری ہے ۔ ہمت اور حوصلہ اس علاج کی بنیادی شرط ہے ۔ مریض کے ساتھ نرمی اور سلوک سے پیش آنا چاہیئے اور ڈاکٹری ہدایات پر عمل کرنا چاہیئے ۔ نفسیات مریضوں کو بھی مریض سمجھا جانا چاہیئے ۔ ان کا علاج بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسمانی طور پہ بیمار مریضوں کا کروایا جاتا ہے ۔ انہیں محبت توجہ اور بہتر ماحول کی ضرورت ہے ــــ انہیں دوسرے عام مریضوں کی نسبت بہت زیادہ توجہ اور صحیح وقت پہ علاج کی ضرورت ہے ۔ لیکن ہمارے یہاں ذہنی مریضوں کے علاج پر گھر والے توجہ نہیں دیتے ۔ اگر شروع میں ہی علاج کروایا جائے تو مریض جلد صحت یاب ہو سکتے ہیں ۔ ان پر اور خود پر ظلم کرنا زیادتی ہے۔

پانچ برس بعد مجھے کسی دشمن نے بتایا کہ جاوید منصور فاؤنٹین ہاؤس کو ہی نہیں اس دنیا کو بھی چھوڑ گیا ہے ۔ اس تکلیف دہ خبر نے مجھے بہت دکھ دیا ۔ یقین نہیں آتا تھا اور جب یقین نہیں آیا تو میں خود فاؤنٹین ہاؤس کی جانب چل پڑی ۔

دل میں اندیشہ تھا کہ کہیں یہ خبر سچ نہ ہو ــــ نہیں ــــ بھلا وہ آواز ــــ اتنی جلد اتنی خاموشی سے ہم سے کیسے بچھڑ سکتی ہے ــ ایسا نہیں ہونا چاہیئے ۔

دھڑکتے دل سے فاؤنٹین ہاؤس کے دروازے کے اندر قدم رکھا ــ اب یہاں پہلے سے

بہت زیادہ تعداد میں ہاؤس ممبرز تھے ۔ کچھ دیکھے بھالے چہرے اور بہت سے انجان ۔ انہی چہروں میں سے ایک چہرہ آگے بڑھا اور مجھ سے مخاطب ہوا ــــ باجی ! آپ اخبار والی ہیں نا ۔ آپ میرا انٹرویو لیں ۔ میں بہت بڑا آدمی ہوں اور وہ دیکھیں نا وہ جو ڈاکٹر صاحب ہیں ، ڈاکٹر صاحب میرے قریب آئے ، مجھ سے بہت سی باتیں کیں ، ہاؤس ممبرز کے بارے میں باتیں ۔ شیزوفیرینیا کے بارے میں باتیں جب وہ رخصت ہوئے تو معلوم ہوا یہ بھی ہاؤس ممبر تھے ــ حیرت سے میں نے دُور جاتے ہوئے اس شخص کو دیکھا ــ اور تھک کر گھاس پر بیٹھ گئی ۔ جب ذرا سنبھلی تو ڈرتے ڈرتے جاوید منصور کا نام لیا ــــ جاوید ــــ ابھی بُلاتا ہوں ــــ یہ سُن کر تسلّی ہوئی کہ شکر ہے وہ خبر جھوٹی تھی ــــ جاوید زندہ ہے ــــ تھوڑی دیر بعد جاوید آیا ــــ جاوید کے بال اب زیادہ سفید ہو گئے تھے ــــ سنجیدگی گہری ہو گئی تھی ــــ آواز زیادہ گمبھیر ہو گئی تھی ــــ ۔

مجھے دیکھتے ہی اُس نے پہچان لیا اور کہا ــــ باجی آپ بہت دن بعد آئی ہیں ۔ اتنی اچھی ہیں آپ پھر اتنی جدائی ــــ ہم لوگوں نے آپ کو بہت یاد کیا ــــ آپ جیسے لوگ آ جاتے ہیں تو وقت کٹ جاتا ہے ــــ ورنہ زندگی بہت مشکل ہے ــــ ہے نا ــــ ؟

ہاں جاوید ــــ زندگی بھی بہت مشکل ہے ــــ پھر میں روز کہاں آ سکتی ہوں ۔ میں تم سب کو دُکھی دیکھ کر خود کس قدر دُکھی ہو جاتی ہوں یہ میں تمہیں کیسے بتاؤں ــــ ؟ تمہیں نہیں معلوم یہاں سے جانے کے بعد میں کتنے دن بیمار رہتی ہوں ــــ کس اذیت سے گزرتی ہوں ــــ میں تم سب کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی ــــ ہم سب بے بس ہیں ــــ خود غرض ہیں ــــ ہم خود کو بیمار نہیں بنانا چاہتے ــــ ہم ذہنی مریض نہیں بننا چاہتے ــــ تم نے مجھے یاد کیا تو کیا میں تمہیں بھول گئی ــــ ؟ اگر بھولی ہوتی تو آج یہاں نہ آتی ــــ میں تمہیں یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں ــــ ؟ تمہیں دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے لیکن ساتھ ہی یہ دُکھ بھی کہ تم ابھی تک یہیں ہو ــ اور یہ بھی جان کر صدمہ ہوا کہ پہلے عورتوں کے حصّے میں صرف

چار عورتیں تھیں اور آج چالیس سے زائد ہیں — تم کیا سمجھتے ہو میں بے حس ہوں —
یہ سب دیکھ کر جان کر محسوس کر کے میں پریشان نہیں ہوتی — میں اُداس نہیں ہوتی —
کیا میں تمہارے دُکھ درد کو نہیں سمجھتی — میں تو تمہارے اور تم جیسے مریضوں کے غم اپنی جان
پہ جھیلتی ہوں اور یہ سوچ کر اُداس ہو جاتی ہوں کہ کچھ بھی میرے اختیار میں نہیں - میں نہ مسیحائی
کر سکتی ہوں نہ دلاسہ دے سکتی ہوں - صرف فاؤنٹین ہاؤس اور مینٹل ہسپتال کے نام سُن کر
کانپ سکتی ہوں جہاں ہزاروں انسان کیسی کیسی اذیتیں سہہ رہے ہیں اور خاموش ہیں -
لیکن ان کی آنکھیں ان گنت کہانیاں کہتی ہیں - یہ اور بات کہ ہم سُن نہیں سکتے یا سُننا
نہیں چاہتے کہ ہم ٹینشن برداشت نہیں کر سکتے اور کوئی بھی ذی شعور ان حالات واقعات
کو جھیلنے کے بعد نارمل نہیں رہ سکتا - ہم نارمل رہنا چاہتے ہیں - ہم دُکھ کی زندگی جیتے
ہیں لیکن سُکھ کی نیند سونا چاہتے ہیں —

میں اُس روشن صبح کی منتظر ہوں جو جاوید منصور اور فاؤنٹین ہاؤس کے تمام ہاؤس ممبرز
کے لیے نئی زندگی کی نوید لائے گی -

ہم سب جاوید اور اس کی طرح کے لاکھوں افراد کے مجرم ہیں کہ ہم اسی معاشرے کا ایک
حصہ ہیں —

اگر ممکن ہو تو یہ سب ہمیں معاف کر دیں — ہمارے اس جرم کی سزا تو ہمارا اپنا جیون ہے -
ہم بھی سزا جھیل رہے ہیں - ہمیں اسی آگ میں جلنا ہوگا — ہم -
ہمارے سر احساسِ گناہ سے جُھکے ہوئے ہیں اور ہماری آنکھیں پشیمانی کے اشکوں سے نم ہیں -
ہم ان کے درد کا درماں نہیں کر سکتے — تو کیا چند لمحوں کے لیے ان کا درد بھی نہیں
بانٹ سکتے -

ہم سب لوگ ان دماغی اور نفسیاتی مریضوں کے مجرم ہیں — گناہگار ہیں — انہیں ان جگہوں
تک پہنچانے کی ذمہ داری ہم پر آتی ہے -

آیئے ہم سب اپنے اپنے گناہوں کا اعتراف کریں - شائد اسی طرح ہم کچھ تلافی کر سکیں -
ہمیں زمین پر خُدا بننے اور انسانوں پر ظلم کرنے کی اجازت ربّ کریم نے کبھی نہیں دی تھی ہم
اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے کا جرم کر بیٹھے ہیں

آیئے ہاتھ اُٹھائیں — عجز و انکسار سے اس سے معافی طلب کریں — شائد وہ ہماری توبہ
قبول کر لے — بشرطیکہ ہم خلوصِ نیت سے توبہ کے دروازے پہ دستک دیں اور اس کی
رحمت کے طلبگار ہوں -

سلاخوں سے ادھر

اس کہانی کا اہم کردار کون ہے ــــ کیا اس کہانی کے کرداروں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے۔ تمام کردار مردوں کے ہیں یا عورتوں کے ــــ؟ اگر کردار انسان نہیں ہے تو پھر کون ہے ــــ؟ کوئی موسم یا ہر موسم ــــ؟ روشن صبح۔ تپتی دوپہر یا پھر ڈھلتی شام ــــ یا تاریک اور پُراسرار رات ــــ اس کہانی کا کردار ہے کون ــــ؟ بوڑھا وقت یا جوان لمحہ ــــ ممکن ہے ان میں سے کوئی کردار نہ ہو ــــ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کردار ادا کرنے والی کوئی عورت ہو ــــ کون سی عورت ــــ شائد وہی عورت جو کہانی لکھتی ہے اور کردار بناتی ہے ــــ آج خود ایک کردار بن گئی ہو۔ عورت جس کی زندگی رات جتنی طویل کہانی پہ محیط ہے۔ یا ایک گزرتے لمحے جتنی مختصر۔ زندگی طویل ہو یا مختصر ــــ اس کی کہانی کون لکھتا ہے ــــ؟ کردار کون بنتا ہے ــــ؟ اداکاری کون کرتا ہے ــــ؟ ان سب باتوں سے بظاہر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ درحقیقت بہت معمولی باتوں سے بہت زیادہ فرق پڑ جاتا ہے۔

اگر بات صرف ایک لمحے کی کی جائے تو ایک لمحہ بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ کوئی ایک لمحہ زندگی دے دیتا ہے یا پھر زندگی چھین لیتا ہے۔ ہر لمحہ ایک کہانی ہے۔ ہر کہانی ایک ٹھہرا لمحہ ہے۔ میں بھی وہی ایک لمحہ ہوں۔

میں کہانی لکھتی تھی مگر آج کہانی نے مجھے لکھا ــــ برسوں کی حرف آشنائی سے محسوس ہوا کہ میں عمر بھر ایک ہی کہانی کے مختلف حصے لکھنے کی کوشش کرتی رہی بکھرے حصوں کو سمیٹنے اور اکٹھا کرنے کا جتن کرتی رہی۔ اس تمام سلسلے میں خود کو بکھیرتی رہی ــــ اب تو میرے ٹکڑے جانے کہاں کہاں بکھرے پڑے ہیں کہ ان کو تلاش کرنا بھی بہت دشوار ہوگا ــــ ممکن ہے تلاش ادھوری رہ جائے ــــ میں ادھوری کہانی لکھتی رہی ہوں۔ ایک ہی

کہانی لکھتے رہنے کی سزا میں کبھی میں خود کو دُھراتی بھی رہی — دُھرانے کا عمل بہت عجیب ہے۔ اس کا ردِ عمل کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں دُھراتی جانے والی باتوں کو ناپسند کرتی رہی ہوں۔ دُھرائی جانے والی باتوں سے منافقت کے لہو کی بو آتی ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں تمام عمر ادھوری کہانی لکھتی رہی ہوں — لکھتی رہوں گی — شائد کہانی کو مکمل کرتے کرتے میری بھی تکمیل ہو جائے لیکن کبھی کبھی لکھنے کے عمل سے گزرتے حرف گرفت نہیں آتے۔ کبھی قلم لکھنے سے انکار کر دیتا ہے — کبھی خیالات منتشر ہو جاتے — ہم موضوع سے بھٹک جاتے ہیں۔

میں بھی ایک بھٹکی روح ہوں خود کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اپنے متعلق جب جان لیتی ہوں تو آگہی کا درد سہتی ہوں — آگہی موت ہے — میں موت سے نہیں ڈرتی — میں موت میں رہتی ہوں — میں موت کو جانتی ہوں۔ موت جو سرد اور تاریک ہے خاموش اور پُراسرار ہے — میں بھی موت ہوں — میں جو برسوں برف بنی رہی — یہ جھٹلاتی رہی کہ برف بھی آنچ دیتی ہے۔ میں اپنے اندر کی آگ سے خود کو چھپاتی رہی — بچاتی رہی — مجھے کسی دوسرے سے نہیں ہمیشہ اپنے آپ سے خوف محسوس ہوا ہے کہ میں خود کو جانتی اور پہچانتی ہوں۔ میں شدت پسند ہوں — اپنی شدید طبیعت اور مزاج سے واقف ہوں اسی لیے خوفزدہ ہوں۔ خوف انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے — میں تکلیف کی اذیت سے آشنا ہوں اسی لیے ڈرتی ہوں — جیسے میں آئینے سے ڈرتی ہوں — کرب کی جھریاں جب روح بدن پہ منتقل ہوتی ہیں تو حُسن کی صورت بھی متاثر ہوتی ہے — میں حُسن پرست ہوں مگر میں بدصورتی سے بھی محبت کرتی ہوں — میں ہر بدصورتی کو قبول کر سکتی ہوں لیکن اپنی ذات کی بدصورتی کے خیال سے کانپ جاتی ہوں — میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔

میں تو اس منظر سے بھی خوفزدہ ہو گئی تھی جب میں نے بہتی آبشار میں دھکتی آگ کو دیکھا تھا۔ میں پانی میں آگ کو دیکھ کر اپنے اندر کی آگ کے احساس سے لرز گئی تھی — میری کپکپاہٹ کو میرے

پاس کھڑی ہوئی اس لڑکی نے حیرت سے دیکھا تھا — میں نے بھی اتنی ہی حیرت سے اس لمحے اپنا چہرہ دیکھا تھا — اور سوچا تھا کیا یہ میں ہی ہوں —؟ وہ میں ہی تھی — اور آج بھی میں اتنی ہی حیرت سے خود کو دیکھ رہی ہوں — آج میرے بدن کی عمارت کی شکل و صورت تبدیل ہو چکی ہے — میں اپنے نئے روپ کو حیرت سے دیکھ رہی ہوں — میں جو تمام راستوں سے خود کو بچا کر اتنی دُور تک لے آئی تھی — آج کیوں اس دوراہے پہ رُک گئی ہوں۔

آج یہ کس مقام پہ ٹھہر گئی ہوں۔ میرے پاؤں کے گرد سُرخ دائرہ کھینچ گیا ہے — میرے پاؤں پتھر ہو گئے ہیں — میں اسی جگہ جم گئی ہوں — یہ لمحہ منجمد ہو گیا ہے۔

میں سفر کرتے کرتے تھک گئی ہوں — اب میرا ذہن مزید سفر پہ آمادہ نہیں ہوتا — میں جو تھکن کی آخری حد سے گزر چکی ہوں۔ میں جو انجام سے باخبر ہوں — میں جو ہر درد سے گزر چکی ہوں — آج سوچتی ہوں — یہ تھکن کیسی —؟

تنہائی کی شدت پہلے بھی تھی مگر آج انتہائی ہے۔ تنہائی کا یہ احساس کیوں ہے —؟ اذیت کیسی ہے —؟

روح میں درد کی ٹیس کیسی ہے —؟ آنکھوں میں نمی کیسی ہے —؟ اتنے آنسو کس کے نام —؟

مجھے اپنا ہر روپ مختلف اور نیا دکھائی دے رہا ہے — میں کیسے کردار ادا کر رہی ہوں — میں خود کو اجنبی جان رہی ہوں۔ اجنبی کو اپنا جان رہی ہوں — یہ اجنبی کون ہے —؟ شائد میرا اپنا عکس — جو میری طرح کھنڈر میں رہتا ہے — سُر تال پہ سُر دُھنتا ہے — سمندر میں جیتا ہے — قبروں سے پیار کرتا ہے — پتھروں کو چاہتا ہے — مٹی کو جانتا ہے۔ شائد وہ میرا ہی کوئی بچھڑا ہوا حصّہ ہے — وقت کی کوئی ٹوٹی کڑی — میں اسے زنجیر کرنا چاہتی ہوں — میں وقت کو اسیر کرنا چاہتی ہوں — وقت جو ٹھہرنے کی عادت میں مبتلا نہیں ہے مگر ٹھہر گیا ہے۔ رُک گیا ہے — میں آج خود سے رہائی چاہتی ہوں

جب میں نے سلاخوں سے اُدھر اپنی ماں کو دیکھا تھا جو سیاسی قیدی تھی میں نے

یہی محسوس کیا تھا کہ جیسے میں خود قیدی ہوں اور وہ آزاد ہے ــــ تب مجھے آزادی کا لمحہ ــــ آزادی کا تصوّر کس قدر اہم کس قدر ضروری اور قیمتی محسوس ہوا تھا۔

میں قید میں ہوں۔ اس کا علم مجھے کب ہوا تھا ــــ؟ جب میں نے اپنی مرضی سے جینے کی خواہش کی تھی اور مجھے روک دیا گیا تھا۔ اپنی قید کا علم مجھے کیسے ہوا تھا ــــ؟ ایسے کہ میں چیخنا چاہتی تھی مگر چیخ نہیں سکتی تھی۔ میری آواز کھو گئی تھی ــــ میں بات کرنا چاہتی تھی مگر کوئی سُننے والا نہیں تھا ــــ میرے پاس آواز کے لیے حرف بھی نہیں تھے ــــ۔

میں قید میں بھی تھی ــــ میں ہمیشہ قید میں رہی اور وہ سب آزاد رہے ــــ وہ سب آزاد ہی ہیں ــــ میں موت سے گزر رہی ہوں اور وہ زندگی کر رہے ہیں ــــ موت اذیت کی انتہا ہے ــــ میں بھی انتہا ہی ہوں ــــ میں انتہا ہوں۔ سلاخوں سے اُدھر زندگی ہے ــــ سلاخوں سے اِدھر موت ہے۔ میں موت کی کوٹھری میں آخری سانسوں کی منتظر ہوں ــــ چھت کی کڑیاں گنتے گنتے میں نے برسوں کے حساب چُکا دیئے۔

میں ان دیواروں کے بیچ رہتے رہتے خود بھی دیوار بن گئی تھی۔ اِن دیواروں میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ میں تنہائی اوڑھتے اوڑھتے تھک گئی تھی۔ میری آواز ان دیواروں سے ٹکرا کے مجھی تک واپس آتی تھی۔ یہ واپسی عذاب تھی ــــ یہ واپسی اذیت تھی۔ یہ واپسی زہر تھی۔ میں یہ زہر ہر لمحہ پینے پہ مجبور تھی۔ ایک ایک گھونٹ پیتے پیتے میری پیاس جی اُٹھی تھی۔ میں پیاسی تھی ــــ میں پیاسی ہوں ــــ جب روح اور بدن کے اندر طوفان ہو تو راستے بھی تلاش کر لیے جاتے ہیں۔ میرے طوفان نے بھی راستہ ڈھونڈ لیا تھا ــــ اظہار کا بہترین ذریعہ آواز اور حرف ہیں ــــ میں نے آواز کی آگ میں خود کو راکھ کیا۔ پہلے میری آواز میں کھنک تھی، زندگی تھی ــــ آہستہ آہستہ آواز اپنا تاثر کھو بیٹھی ــــ آج آواز میں تھکن ہے ــــ حرفوں میں شکستگی ہے ــــ جملوں میں خاموشی ہے

میں نہیں جانتی کہ کیسے کوٹھری کی دیوار میں دراڑ پڑی اور وقت کی نم آنکھوں نے حیرت

سے دیکھا ــــ تجسس سے سُنا۔ یہ دوسری آواز تھی ــــ سلاخوں سے اُدھر کی دُنیا سے آنے والی آواز ــــ اجنبی کی آواز ــــ۔

اس آواز نے میری روح کے نظر نہ آنے والے داغ بھی دیکھے اور میرے درد کی گہرائی کا بھی اندازہ لگایا ــــ اس کے ہاتھوں نے جہاں مجھے سہارا دیا وہاں گہری نیند میں سوئے بدن کو بھی بیدار کیا۔ اس کے لفظوں نے مجھے تلاش کیا ــــ اس کی آنکھوں نے میری آنکھوں میں پوشیدہ کہانی پڑھی اور میری ہی نظموں کا مفہوم مجھے بتایا۔ اس نے طوفان کی شدّت کو بھی جانا اور پھر ہی کیفیت کا شکار تھے ــــ ایک ہی لمحے سے گزر رہے تھے ــــ شائد وہ بات جو ہزاروں نوری برسوں نے بھی نہ کہی ہو وہ اس ایک لمحے نے مجھ سے کہہ دی۔

میں اندھیرے میں جیتے جیتے تھک گئی تھی اور میری تھکن کے پاؤں سے لہو رس رہا تھا ــــ اس نے اسی ظالم لمحے میں مجھے پکارا تھا۔ میں آواز پہ ٹھہر گئی ــــ اس آواز میں میری شناخت تھی ــــ ان آنکھوں میں میری زندگی تھی ــــ میں رگ گئی تھی ــــ میں رُک گئی ہوں ــــ وہ آئے تو میرے پاؤں سفر پہ روانہ ہوں ــــ وہ دوبارہ نہیں لوٹے گا ــــ وہ تو مجھی میں کہیں موجود ہے۔ مجھ سے دُور جائے گا تو واپس آئے گا ــــ اُسے مجھی میں رہنا ہوگا ــــ میرے ہی ساتھ جینا ہوگا کہ میں اس کی ضرورت ہوں۔ عادت نہیں۔

اگر وہ برسوں پہلے آجاتا تو کیا وقت کے ہاتھ مجھے زخمی کر سکتے تھے۔ کیا تجربے مجھے بوڑھا بنا سکتے تھے کیا میں عمر سے بہت آگے نکل سکتی تھی جہاں تنہائی کی جھلستی دھوپ ہوتی ہے ــــ اُداسی انگلی کا چھلہ بنتی ہے ــــ جہاں کوئی درد آشنا نہیں ہوتا ــــ کوئی روح میں نہیں جھانک سکتا ــــ کوئی دوستی کے معنی نہیں جانتا ــــ ہر طرف اجنبی درندے ہوتے ہیں ــــ جہاں پر شہر بھی شہر نہیں ہوتا جنگل ہوتا ہے ــــ اس جنگل سے شہر کی طرف میں تنہا نہیں لوٹ سکتی ــــ مجھے شہر کا منظر اُس نے دکھایا جس سے جُدائی میں نہیں چاہتی ــــ میں اس لمحے سے خوفزدہ ہوں۔ یہ خوف ہر خوف سے زیادہ بڑا ہے ــــ میں اس خوف کا درد بھی بدن پہ نہیں سہہ سکتی ــــ میں انتظار کی آگ

میں جلتے جلتے راکھ ہوگئی ہوں — اب جدائی کو جان پر نہیں جھیل سکتی — یہاں میرا سارا علم — میرا سارا فن نگاہیں جھکائے کھڑا ہے — یہاں میرا صبر ادھورا ہے — یہاں میرا حوصلہ کم پڑ گیا ہے — میں اپنی شکست تسلیم کرتی ہوں — میں بھیگی آنکھوں سے اُس کا چہرہ دیکھتی ہوں — مُسکراتی ہوں اور پھر اس کے حصار میں قید ہو جاتی ہوں — میں کیسی قیدی ہوں — میں رہائی چاہتی ہوں اور مجھے قید کرنے والا میری رہائی سے آگاہ ہے مگر رہائی دیتا نہیں کہ ہماری زندگی کے تجربے اور خواب ایک ہو سکتے ہیں مگر حقدار نہیں — سلاخوں سے اِدھر آواز تو آسکتی ہے مگر زندگی نہیں — موت کی کوٹھری میں قید عورت مر تو سکتی ہے مگر جی نہیں سکتی — خوشی اِس کا مقدر نہیں ہو سکتی — لیکن کون جانے کب کوئی معجزہ رونما ہو جائے اور سلاخوں سے اِدھر جینے والی عورت سلاخوں سے اُدھر کی دُنیا میں جی رہے — ممکن ہے آواز صرف آواز نہ رہے — اور ضرورت پوری ہو جائے وہ ضرورت جو کوئی اور پوری نہیں کر سکتا — ہو سکتا ہے یہ کہانی ادھوری نہ رہے مکمل ہو جائے — ہو سکتا ہے یہ کہانی جو زندگی سے جنمی ہے ادھوری رہ جائے — کچھ بھی ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ کہانی کا انجام آخری لمحے میں تبدیل ہو جائے — !

ایک زندہ کہانی

میرا نام انسان ہے ۔ میں نے اب سے کچھ گھنٹے پہلے ہی اس نئی دُنیا میں آنکھ کھولی ہے ۔ اب اپنی زندگی کے کچھ ہی گھنٹوں بعد میں سسک سسک کر مرنے پہ مجبور ہوں ۔

یہ انسان اتنے کم ظرف کیوں ہیں یہ کسی دوسرے انسان کو برداشت کیوں نہیں کر سکتے — ؟ ان چند گھنٹوں کی زندگی نے مجھے بہت سے پہلے آنے والے انسانوں کا جو چہرہ دکھایا ہے اُس سے مجھے شدید نفرت کا احساس ہو رہا ہے — میں بھی اتنا کم عمر ہوں کہ ان جذبوں سے ٹھیک طور پہ آشنا بھی نہیں ہو پایا — جو انسانوں کی زندگی کا حصّہ ہیں — لیکن میں محسوس کر سکتا ہوں — میں اپنے احساس کو زبان نہیں دے سکتا — لیکن میری آنکھوں نے اس کہانی کو رقم کیا ہے — ان لمحوں کو عکسبند کیا ہے — میں اس وقت کا سب سے اہم کردار ہوں — میں موت کے ہاتھوں زندگی حاصل کر رہا ہوں ۔

آپ حیران نہ ہوں اس لیے کہ حیرت کے رنگ سے آپ واقف نہیں ہیں آپ نے اپنے چہرے صرف نفرت کے رنگ سے رنگے ہوئے ہیں ۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ رات کے آخری پہر میری ماں مجھے یہاں خدا کی حفاظت میں چھوڑنے آئی تھی — اُس کے آنسوؤں نے بے شمار دُعاؤں کی سسکیاں بھری تھیں اور مجھے الوداع کیا تھا — اُس کے چہرے کی زردی اس جدائی کے دُکھ کو بیان کر رہی تھی — مجھے علم ہے وہ شدید دُکھ اور مجبوری میں مجھے یہاں مسجد کی سیڑھیوں پہ چھوڑ گئی تھی — ورنہ وہ ایسا نہ کرتی — اگر وہ میرے انجام کی خبر رکھتی تب یقیناً وہ ایسا نہ کرتی — وہ ہرگز ایسا نہ کرتی — ۔ جب اُجالے نے تاریکی کے بدن سے لباس چھینا تب ان انسانوں کی آنکھوں نے میرے بدن اور روح کو چھلنی کیا ۔ وہ خدا کے گھر میں آنے والے اور خدا کے گھر میں رہنے والے اُس کا پیغام بھول گئے ۔

جو خدا کے گھر کا محافظ تھا اسی محافظ نے مجھے ناپاک اور ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا ــــ۔
پھر ان سب انسانوں نے مل کر میرے معصوم وجود کو پیروں تلے روندا ــ ان کی شرمناک نگاہوں اور ان گنت پتھروں نے میرے بدن کو سنگسار کیا ــ میں خدا کے گھر اسی کے بندوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔ یہ قتل شب کی تاریکی میں نہیں بلکہ دن روشنی میں کیا گیا ــ یہ قتل ایک بڑے شہر میں رہنے والے بڑے معززین کے ہاتھوں ہوا ــ ان کے ہاتھوں سے اب بھی لہو ٹپک رہا ہے اور وہ سب اپنے کئے پہ نادم بھی نہیں ــ یہ سچ ہے کہ انسان ہی انسان کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس قتل کو انہوں نے قتل تسلیم نہیں کیا ــ اسے واقعہ بھی نہیں جانا گیا ــ شائد اسی لیے اسے غیر اہم جانتے ہوئے لوگوں نے نظر انداز کر دیا ــ انہوں نے اسے خبر بھی نہیں مانا ــ یہ اہم خبر نہیں تھی اسی لیے اخباروں میں شائع نہیں ہوئی ــ اگر شائع بھی ہو جاتی تو اس ماں کے سوا کسے احساس ہوتا ــ کسے غم ہوتا ــ ؟ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انسان منافق ہو گیا ہے وہ حقیقت سے گریز کرتا ہے اور میں نے اس مختصر زندگی میں یہ بھی اندازہ لگایا ہے کہ انسان انتہائی بے حس ہو چکا ہے ــ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا میں خدا کے گھر میں خدا کے نیک بندوں کے ہاتھوں قتل ہوتا ــ ؟ میں نے زندگی کے آخری لمحوں میں یہ سوچنے کی کوشش بھی کی تھی کہ میں ناپاک کیسے ہوں اور مجھے ناجائز کیوں کہا گیا ــ ؟ مجھے اپنے سوال کا جواب نہیں ملا تھا ــ جواب سے پہلے ہی میری سانس خاموش ہو گئی تھی ــ میں نے اپنا سوال انسانوں کی سانسوں میں منتقل کر دیا ــ میں خبر میں نہیں ذہنوں میں سوال کی صورت زندہ رہوں گا ــ مجھے یقین ہے ــ لیکن میرے سوال کا جواب کون دے گا ــ ؟ جواب کون تلاش کرے گا ــ انسان یا وقت ــ ؟